من آنم

(مدیر نقوش کے نام خطوط)

فراق گورکھپوری

ادارہ فروغ اردو، لاہور

بار اوّل	۱۹۶۲ء
تعداد	ایک ہزار
قیمت	روپے

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے ادارہ فروغِ اُردو لاہور سے چھپوا کر شائع کی

میں نے کئی بار سوچا کہ اس کتاب کا خالق کون ہے۔ میں یا فراق ؟
—— یہ بات میرے ذہن میں اس لیے آتی ہے کہ یہ خط فراق صاحب نے لکھے نہیں۔ میں نے لکھوائے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں، جب مجھ پہ لکھنے کا دورہ پڑا تو میرا دماغ، شخصی مضامین لکھنے کی طرف چلا، اپنی اس بیماری کی بنا پر، چند ایک باتیں فراق صاحب سے بھی پوچھنی پڑیں —— جواب میں ان کا اتنا مفصّل خط ملا تھا کہ میں اپنی بات بھول گیا۔ ان کے جواب میں کھو گیا۔

اس کے بعد میں نے ایک پروگرام کے ماتحت، فراق صاحب کو خط لکھے۔ پروگرام یہ تھا کہ بہانے بہانے، اس 'جن' کی پوری شخصیت کو ایک بوتل میں بند کر کے رکھ لوں۔ تاکہ آڑے وقت کام آئے —— یعنی میرے یا ان کے مرنے کے بعد، جن کو بوتل میں سے نکالا جائے۔

یہ خط جو آپ کے سامنے ہیں۔ ان کے مرتّب کرنے میں مجھے بڑی دقّتیں پیش آئیں۔ اس لیے کہ فراق صاحب کو پہلے پہل یہ علم نہ تھا کہ یہ خط چھپیں گے بھی، اس لیے انھوں نے اپنے قلم کو جیسے چاہا ہنکایا۔ اس سے

جہاں بھتوڑی بہت بے راہ روی کو جگہ ملی۔ وہاں اُن کے پُرخلوص اور سچے جذبات بھی اُبھر کر سامنے آئے۔ یوں میں سمجھتا ہوں کہ نقصان کم فائدہ زیادہ ہوا۔

ان کے کچھ خط ابھی میں نے پیش نہیں کیے۔ اس لیے کہ اُن میں یہ کچھ زیادہ ہی مخلص اور کچھ زیادہ ہی سچے ہو گئے ہیں — چونکہ زیادہ مخلص انسان اپنی تمام تر ہوش مندی کے باوجود پاگل اور زیادہ سچا انسان، اپنی تمام تر شرافت کے باوجود بدتمیز کہلاتا ہے۔ اس لیے میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے اس پیارے دوست کو ان "خرابیوں" سے بچا لے جاؤں۔ اس کے باوجود فراق، ان خطوں میں ہر طرح سے اور ہر رنگ میں سامنے آئے ہیں — یہی فراق کی وہ خوبی ہے جس پہ مصلحت آمیز شرافت کے سارے غلاف نثار کیے جا سکتے ہیں۔

میں ان خطوں کو اپنی اور فراقؔ صاحب کی زندگی میں اس لیے چھاپ رہا ہوں۔ تاکہ کل کلاں کو کوئی بقراط قسم کا محقق یہ ثابت کرنے پر اپنا وقت ضائع نہ کرے کہ یہ خط فراقؔ صاحب کے لکھے ہوئے ہی نہیں۔ اس لیے کہ طفیل کا انتقال تو فلاں سنہ میں ہو گیا تھا اور یہ خط اس کے مرنے کے بھی آٹھ برس بعد تجزیا می شخص نے لکھے تھے۔

محمد طفیل
۲۵ر اپریل ۱۹۶۱ء

ترتیب

ابتدا میں جو خط ہیں۔ اُن میں فراقؔ کی شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور کسی حد تک فن پر بھی۔

بعد کے خطوں میں، اسلامی ادب پر، ان کے خیالات کا اظہار ملتا ہے۔ جن سے ہمیں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔

آخری حصہ محمود احمدؔ کے مضمون پر مشتمل ہے۔ جو فراقؔ کے فن پر جامع اور مکمل تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے ـــــ اس سے زیادہ میں اس مضمون کے بارے میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔

(مرتب)

۱

۸/۴ بینک روڈ۔ الٰہ آباد
۱۴- فروری ۱۹۵۲ء

برادرم طفیل صاحب۔ تسلیم

ایک مدت ہوگئی جب آپ کا محبت نامہ ملا تھا۔ میری بدتوفیقی دیکھئے کہ اندازاً چار ماہ بعد جواب لکھنے بیٹھا ہوں۔ ادھر کئی برسوں سے میرے لیے بڑی مصیبت یہ ہوگئی ہے کہ میرے پاس جتنی بھاری ڈاک آتی ہے اس کا جواب دینا میرے بس کی بات نہیں۔ آپ کے خطوط تو میرے دل و دماغ میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں، لیکن بہت سے خطوط ایسے بھی آتے ہیں جن میں احباب خلوص و محبت کی باتیں تو لکھتے ہیں لیکن جنھیں پڑھ کر عموماً تھکاوٹ سی محسوس کرتا ہوں، شہرت میرے لیے ایک مصیبت ہوگئی ہے۔ پھر میری حیثیتیں بھی کئی ہیں۔ ا۔ دو ہندی

انگریزی، تمام حلقوں سے نظموں، غزلوں، نثر کے مضامین، پیغامات، اصلاح مشورے کی مانگیں آتی رہتی ہیں، جو ذہن میں ایک پراگندگی اور انتشار پیدا کر دیتی ہیں پھر لکچروں اور تقریروں کی بھی مانگیں آتی رہتی ہیں اور ان سب پر مستزاد انگریزی ادب کے معلّم کے کارِ منصبی کی ذمہ داریاں، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے لیے میری ڈاک صرف امیدوں کی حامل نہیں ہوتی۔ بلکہ امید و بیم کی حامل ہوتی ہے۔ صحت کی خرابی، نیم خوابی، سوداوی مزاج کی وجہ سے طبیعت کا انتشار، گھٹن، اور گھبراہٹ، جسم کی مستقل تھکن، ہاتھ میں رعشہ آجانے کی وجہ سے لکھنے سے معذوری، ان تمام بلاؤں میں مبتلا ہوں، بہر حال کام کیے جا رہا ہوں اور ہانپ ہانپ کر ایک ادیب کے فرائض جیسے تیسے پورے کرتا جا رہا ہوں۔ عمر بھی ساٹھ کے لگ بھگ ہے (تاریخ پیدائش: ۲۸ راگست ۱۸۹۶ء) پھر بھی اپنے شعور کو کچھ ایسی تربیت دے سکا ہوں کہ داخلی سکون کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اس امر کا خیال رکھتا ہوں کہ جو جو طوفان اٹھتے رہیں وہ میری شخصیت کی سطحوں پر اگر ہلچل مچا دیں تو بھی میرے شعور کی گہرائیاں اپنا سکون و توازن قائم رکھیں۔

آپ نے تو ایک سانس میں کئی باتیں کہہ دی ہیں، لیکن میں سانس لے کر بھی سب باتیں کہنا چاہوں، تو بھی آپ کی ساری باتوں کا جواب مشکل ہے — بہرحال آپ سے کچھ کہے بغیر جان چھڑانا بھی مشکل ہے، اس لیے آج یہ عرض کیے

دیتا ہوں ۔ کہ مجھے شعر کہنے کے لیے کسی خاص ماحول یا موڈ کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں ؟"

بظاہر میری زندگی کا خارجی ماحول دوسروں کی زندگی کے خارجی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں ہے ۔ میرا تعلق وسطی طبقے سے ہے اور اس طبقے کی عام خصوصیتیں اپنی زندگی میں بھی میں پاتا ہوں ۔ اس طبقے کی اچھی بُری باتیں خوبیاں اور کمزوریاں اپنی زندگی میں پاتا ہوں ۔ اس کے باوجود اپنی ایک انفرادی شخصیت بھی رکھتا ہوں جس کے نمایاں خط و خال ہیں اور جو مجھ کو اپنے ہمچشموں سے متمائز کرتی ہے ۔ بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بہنوں سے اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا ۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ جذباتی تھا ۔ محبت اور نفرت کی غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا ۔ مانوس چیزیں بھی مجھے حد درجہ مانوس اور حد درجہ عجیب محسوس ہوتی تھیں ۔ مناظرِ قدرت سے میں اتنا متاثر ہوتا تھا کہ اُن میں کھو جایا کرتا تھا ۔ میرے بچپن کی دوستیاں بھی بہت شدید قسم کی ہوتی تھیں ۔ بچپن کے کھیل اور کھلونوں سے بھی اتنی زبردست لگاوٹ محسوس کرتا تھا کہ گھر والے تعجب کرتے تھے ، اور کبھی کبھی میرا مذاق اڑاتے تھے ۔ میری والدہ کا کہنا ہے کہ دو تین برس کی عمر ہی سے میں کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتا تھا ۔ بلکہ یہاں تک ضد کرتا تھا کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آنے پائیں ۔ اس کی خوب ہنسی اڑتی تھی اور کبھی کبھی اس کے لیے مجھے چڑایا بھی جاتا تھا ۔ نو دس برس کی عمر ہی سے جس

لڑکی یا لڑکے کو، مرد یا عورت کو، اپنے نزدیک میں خوبصورت سمجھتا تھا۔ اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا جسم بلکہ میری ہڈیاں تک پگھل کر رہ جائیں گی۔ شعوری طور پر احساسِ حسن سے برانگیختہ ہونے والی حیثیت میرے اندر سنِ بلوغ سے کافی پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھائی، خلوص اور شرافت کی قدریں بھی مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کرتی تھیں۔ جن گیتوں، کہانیوں اور واقعات میں ان قدروں کی جھلک دکھائی دے جاتی۔ اُن سے میری آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اگرچہ میرا گھر ایک بھرا ہوا گھر تھا اور میں ٹوٹ کر سب سے ملتا تھا۔ پھر بھی بچپن ہی سے اپنے اندر ایک احساسِ تنہائی پاتا تھا۔ مجھے ہاتھوں یہ بھی بتادوں کہ بچپن میں جو ابتدائی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں۔ اُن کے حسنِ اسلوب سے میں بہت متاثر ہوتا تھا اور بد اسلوبی سے بدمزہ ہوتا تھا، اس طرح زندگی کے ستّرہ اٹھارہ سال کٹ گئے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا چاہتا تھا۔ لیکن جیسا پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری زندگی جذبات سے اتنی لبریز تھی کہ اس عمر میں مجھے اظہارِ جذبات کے لیے الفاظ نہیں ملتے تھے اور شعر گوئی کی خواہش گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھی۔ یہ گھٹن میرے لیے بسا اوقات ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ اندازاً اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری بیوی کی صورت شکل وہی تھی بلکہ اس سے بھی گئی گذری جو اُن لوگوں کی تھی جن کی گود میں جانے سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیا کرتا تھا۔

اور زندگی کی دوسری صلاحیتیں بھی اَن پڑھ انسانوں سے میری بیوی ہیں کم تھیں۔ میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بناکر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی نہ پاگل ہُوا اور نہ جرائم پیشہ بنا، نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوا۔ اس لیے کہ شدید حسن پرستی کے باوجود زندگی کی شرافت کی جو قدریں مان چکا تھا۔ اُن کا میں نے سہارا لیا۔ فرائض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا۔ یہ ضرور ہُوا کہ سال بھر تک مسلسل نیند نہیں آئی اور صحت مستقل طور پر برباد ہو گئی۔ پھر بھی چونکہ علم دوستی کا جوہر بھی مجھ میں تھا۔ اس لیے کالج اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں بہت اُونچی پوزیشن میں لاتا رہا۔ بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے کے پہلے ہی میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت گورکھپوری جو شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے انتقال فرما گئے۔ اور ایک کچی گرہستی کے تمام مسائل میرے سر پہ آگئے۔ پی۔ سی۔ ایس اور آئی۔ سی۔ ایس دونوں کے لیے میرا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیکن بددلی اور بے دماغی نے مجھے اتنا اداس بنا دیا تھا۔ کہ میں دونوں سے مستعفی ہو گیا۔ ان تکلیف دہ اور کرب آگیں حالات میں میں نے شاعری شروع کی اور بہت آہستہ آہستہ میں اپنی آواز کو پانے لگا۔ میرا داخلی موڈ اور خارجی ماحول تو بچپن ہی سے بن گئے تھے۔ اب جب شاعری شروع کی تو میری یہ کوشش ہوئی کہ اپنی ناکامیوں اور اپنے زخمی خلوص کے لیے اشعار کے ذریعے سے مرہم تیار کر دں۔ میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی اتنے

ہی پرسکون اور حیات افزا اشعار کہنا چاہتا تھا۔ بلکہ یوں کہوں کہ تلخی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔ عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھا اور غزل رات رہے ختم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے اُدھر پو پھٹی اور اُدھر غزل کا مقطع ہوا

اُجلے اُجلے سے کفن میں سحرِ شام فراقؔ
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ رات کی کیفیتیں اور رات کی رمزیّت جس طرح میرے اشعار میں فضا باندھتی ہیں، وہ چیز کہیں اور نہیں ملے گی۔ میرے کلام کا ایک حصّہ ایسا ہے جس کی بنا پر مجھے شاعرِ نیم شبی کہا جا سکتا ہے۔ مندرجہ بالا شعر کے کہنے کے پچیس برس بعد میں نے یہ رباعی کہی :

دن ڈوب گیا تو بات کچھ اور بھی ہے
آنکھ اوجھل واردات کچھ اور بھی ہے
خاموشی و تیرگی و خنکی کے سوا
اے انجم و ماہ، رات کچھ اور بھی ہے

'آدھی رات' اور 'جھلکیاں' کے عنوان سے میری دو نظمیں رات کی ترجمانی اور مصوّری کی مثالیں ہیں۔ اُن کے علاوہ میرے پورے کلام میں رات کے متعلق صدہا اشعار اور رباعیاں بکھری ہوئی ملیں گی۔ یہ خط اپنے اس مقطع کے ساتھ ختم کرتا ہوں ؂

فراقؔ دیکھ شبِ غم گدازِ قلبِ نجوم   چھڑا ہوا ہے سکوتِ ابد کا افسانہ

کچھ اور اشعار یاد آ گئے ہیں۔

تاریکیاں چمک گئیں آوازِ درد سے
میری غزل سے رات کی زلفیں سنور گئیں

چھڑتے ہی غزل بڑھتے چلے رات کے سائے
آواز مری گیسوئے شب کھول رہی ہے

جب سازِ غزل کو چھوتا ہوں راتیں لَو دینے لگتی ہیں
ظلمات کے سینے میں ہمدم میں روز چراغاں کرتا ہوں

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے   اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

اچھا اب رخصت چاہتا ہوں۔ لیکن "رخصتی" سے پہلے اتنا پوچھنا چاہتا ہوں، کہ ایکا ایکی آپ کو میرے بچپن اور میری ذات سے اتنی دلچسپی کیوں پیدا ہوگئی ہے، اگر ان باتوں کا صاف صاف جواب دیجئے گا، تو میں بھی صاف گوئی پر بہ آسانی اتر آؤں گا۔

ایک بولتی ہوئی غزل حاضر ہے۔ اپنی رائے سے ضرور اور جلد

مطلع فرمائیے گا۔ اس لیے کہ شاعر ہر وقت داد کا محتاج ہے، اور مجھے تو میرے فن نے باقی شعراء سے کچھ زیادہ ہی بھوکا بنا دیا ہے۔

آپ کا

فراق

مکرّر، میری صحت اب کسی طرح سنبھل نہیں سکتی۔ اگر کچھ دن جیتا بھی رہا تو اسی فکر میں جینا ہوگا۔ کہ اپنا مجموعۂ کلام اور دیگر تصانیف کسی ایسے ناشر کو سونپ دوں۔ جو میرے اس حاصلِ زندگی کو ضائع اور ناپید نہ ہونے دے۔

۲

۳/۴ بینک روڈ۔ الہ آباد
۲۳ ؍ فروری ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم

کبھی تو آپ بھی میری طرح ڈوب جاتے ہیں اور میں جواب کی راہ تکتا رہتا ہوں۔ لیکن اب کے آپ نے بڑی جلدی جواب دیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے پہلے ہی سے جواب لکھ رہا تھا۔ غزل کی پسندیدگی کا بہت بہت شکریہ!
البتہ مجھے آپ کی یہ بات بہت کھٹکی۔ کہ ایک شعر وزن میں نہیں، علامہ آثر لکھنوی صاحب! اُسے ایک بار پھر پڑھیے، نہ تو اس شعر کو کاٹیے گا اور نہ ہی خود ترمیم کیجیے گا۔ مجھے وہ شعر لکھ بھیجیے۔ میں خود اس کی نبض دیکھ لوں گا۔ آپ نے پہلے تو غزل کی بڑی تعریف کی۔ اور میں بڑا خوش ہوا کہ میرے کلام کو میری ہی طرح اور

بھی عزیز رکھتے ہیں۔ لیکن مقطع میں سخن گسترانہ بات سے نہ ٹلے۔

آپ میرے حالاتِ زندگی سے واقف ہونا چاہتے ہیں، تو میں بھی یہ کوشش کروں گا۔ کہ آپ کی باتوں کا جواب لکھتا رہوں۔ اور اس طرح چار مہینوں کا سکوت اکٹھا توڑوں گا۔

میری زندگی کے داخلی اور خارجی ماحول پر زیادہ نہ سہی کچھ روشنی تو میرے پہلے خط سے پڑی ہوگی۔ اس خط میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ کن محرکات و مقاصد کے زیر اثر میں شعر کہتا رہا۔ یہ بھی بتاؤں گا کہ ازدواجی زندگی کے عذاب ہو جانے کے بعد کیا میری کوئی عشقیہ زندگی بھی رہی ہے اور اس کا میری شاعری پر کیا اثر رہا ہے ـــــ میں شاعری کا ایک مقصد یہ بھی سمجھتا ہوں کہ زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار حالات و تجربات کا ایک سچا جمالیاتی احساس حاصل کیا جائے۔ زندگی کا ایک وجدانی شعور حاصل کرنا، وہ آسودگی اور طمانیت عطا کرتا ہے جس کے بغیر زندگی کے دُکھ سکھ دونوں نامکمل رہتے ہیں۔ یہی احساس میرے محرکاتِ شعری رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قوم کی ایک تاریخ ہوتی ہے اور اس کا ایک مزاج ہوتا ہے۔ اس کی اجتماعی زندگی کی کچھ بلند قدریں ہوتی ہیں۔ پھر تمام انسانیت کی زندگی کی بھی تاریخ ہوتی ہے اور اس زندگی کی کچھ ارتقائی قدریں ہوتی ہیں، قومی زندگی اور عالمگیر زندگی کی ان قدروں اور ہندوستان کے کلچر کے مزاج کو اپنی شاعری میں سمو نا ملکی اور عالمی زندگی کے پاکیزہ محرکات

کو گویائی عطا کرنا ہی میرا مقصد شاعری رہا ہے۔ اُردو شاعری میں بہت سے محاسن
کے باوصف بہت سی بلند چیزوں اور قدروں کی کمی رہی ہے۔ دو مثالیں
لوں گا۔ حالی اور اقبال کی۔ حالی کا دل بہت نرم ہے نیکی اور شرافت اُن میں
کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ لیکن گہرا یا بلند تفکر یا فلسفیانہ دماغ اُن کے
یہاں نہیں ہے۔ یہ چیزیں اقبال کے یہاں بدرجۂ اتم ملتی ہیں۔ لیکن بدنصیبی سے
ایک جنگجوئی کا جذبہ بھی اُن کے یہاں ملتا ہے اور طاقت یا قوت خواہ کسی
طرح کی بھی ہو اس کے لیے ایک اندھی پرستش بھی اقبال کے یہاں ملتی ہے۔
جنگیں جیتنے، ملکوں کو فتح کرنے اور اُن پر اسلامی حکومتیں قائم کر دینے کو اقبال
بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ ایک سنگین گو ختگی مزاج کا اثر اُن کا کلام پڑھ کر نا گزیر
ہو جاتا ہے۔ اسلامی ملت کے تصور کی زنجیروں میں اُن کی
شاعری جکڑی ہوئی ہے۔ شاعری میں میری کوششیں بہت دنوں تک تو سماجی
یا سیاسی یا وطنی موضوعات سے الگ رہیں اور کافی دنوں تک تو اپنی شاعری
میں حسن و عشق ہی کے جادو جگاتا رہا اور اس کی کوشش کرتا رہا کہ جنسیت کو
کم درکیے بغیر اور افلاطونی محبت یا عشق حقیقی سے قطع نظر کر کے جنسیت کو
زیادہ سے زیادہ رچا سکوں اور اُسے رُس جَس سے مالا مال کر سکوں۔ عشق کے
غم و نشاط اور حسن کے تصور کی تہذیب و تالیف شروع ہی سے میری کوشش
تھی۔ عشقیہ شاعری کو سطحیت، تلخی، خشکی، خشونت، مغائرت اور پھوٹے پن

سے بچاتا اور اسی میں زندگی کی اعلیٰ ترین قدریں نمونا یہی میری کوشش رہی ہے۔ مغربی ادب خصوصاً ورڈسورتھ کی شاعری اور انگریزی ادب کے دیگر اکابر و مشاہیر کے کارنامے، سنسکرت ادب کے کارنامے، فارسی ادب کے کارنامے مجھے برابر متاثر کرتے رہتے ہیں۔ میری اُردو شاعری، جذبات و خیالات کے معاملے میں اور معیارِ شاعری کے معاملے میں جتنی غیر اردو ادب سے متاثر رہی ہے اتنا اردو شاعری سے متاثر نہیں رہی۔ البتہ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے۔ میں اُردو شاعری کے مشاہیر سے استفادہ کرتا رہا ہوں، پھر بھی اپنی اُردو کو اپنے وجدان کے سانچے میں ڈھالتا رہا ہوں اور اس کی کوشش کرتا رہا ہوں، کہ میرے اسلوب میں کتابوں کی زبان کے بدلے زندگی کی اور تاثراتِ زندگی کی زبان چیتی جاگتی شکل میں اُجاگر ہو۔ پھر کسی کیفیت کو محض مکمل طور پر بیان کر دینا میرا مقصد نہیں رہا۔ قادر الکلامی ایک طرح کا عجزِ بیان ہے کیونکہ ہر کیفیت یا ہر تخیل کے محدود و منطقی پہلو کے علاوہ اس کا ایک وجدانی پہلو ہوتا ہے جس کے لیے صراحت کے ساتھ ساتھ اشاریت کی بھی ضرورت ہوتی ہے اس اشاریت کو اپنے اشعار میں سمونا میرے خاص مقاصدِ شعری میں رہا ہے۔ اس طرف ہمارے اُردو کے شعراء کی توجہ بہت کم رہی ہے۔

جب میں زندگی میں عمل کی حیثیت سے متاثر ہونے لگا تو اس کے ساتھ ساتھ اشتراکیت کا نصب العین بھی سمجھ میں آنے لگا۔ ۱۹۳۶ء کے بعد سے

میری متعدد نظموں، غزلوں اور رباعیوں میں یہ خیالات جگہ پانے لگے۔ اُشتراکیت کے فلسفہ میں عمل کے جو معنی ہیں وہ انسان کی گذشتہ تاریخ کے عمل کے فلسفوں سے بہت مختلف ہیں۔ اب میری کوشش ایسی نظموں میں یہ ہونے لگی کہ مسائل کو عالمگیر انسانیت کے ارتقا کی روشنی میں پیش کروں، محض متکیف ہونا، یا زندگی جیسی ہے اُس سے متاثر ہونا، قومی کلچر اور قومی مزاج کے تصور پر وجد کرنا اسے اب میں ناکافی سمجھنے لگا۔ اب دنیا اور زندگی پر وجد کرنے کے بدلے دنیا اور زندگی کو بدلنے کا تصور میرے اندر کارگر ہونے لگا۔ دنیا کو بدل دینے کے عالمگیر عمل اور عوامِ عالم کی متحدہ کوششوں کی معنویت، ادو رسی اور اس کے وجدانی پہلو کو ادب میں چمکانے اور روشن کرنے کو میں بہت اہمیت دینے لگا۔ پھر بھی مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میری ذاتی زندگی بہت حد تک جنسیّت زدہ رہی ہے اور ہے ـــــ جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اُسے شعوری اور وجدانی طور پر گہرا بنانے کی کوشش کی ہے، میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جا سکتا۔ کہ کن کن سے میرے تعلقات رہے ہیں، ان تعلقات کو میں نے کس طرح ہضم کیا ہے۔ جنسیت کو کتنا لطیف بنا سکا ہوں۔ جنسی جذبات و تجربات کو کتنا لطیف اور رنگین بنا سکا ہوں، اگر ان باتوں کا پتہ چلانا ہو تو میری غزلوں رباعیوں اور عشقیہ نظموں میں ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنا چاہیے۔

میرے زمانے میں مرد اور عورت آزادی سے مل نہیں سکتے تھے اور

نہ محبت کرسکتے تھے، چوری چھپے کی بات اور ہے۔ اب بھی تبدیلیٔ حالات کے باوجود صورتِ حال بہت کچھ یہی ہے۔ اس لیے مجھے کچھ عورتوں کے حسن سے متاثر ہونے کے موقعے تو ملے ہیں لیکن اُن سے عشق برتنے کے موقعے نہیں ملے ہیں یا بہت کم ملے ہیں۔

پاکیزگی جنسی تعلق سے بچنے کا نام نہیں ہے، بلکہ اس تعلق کو وجدانیت اور جمالیاتی صفات سے متصف کرنے کا نام ہے۔ جو چیز اس محبت کو بلند کرتی ہے وہ وہی ہے جو معمولی جانوروں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے یا معمولی آدمیوں کی جنسی زندگی اور جنسی تعلقات سے ایک حساس اور رچے ہوئے دل و دماغ والے انسان کی جنسی زندگی کو داخلی طور پر مختلف بناتی ہے۔ جب جنسی جذبات کسی شخص کی پوری شخصیت میں حلول کر جائیں اور اس کے مستقل کردار کا جزو بن جائیں اور جب جنسی خواہش کے مقابلے میں احساسِ جمال بہت زیادہ بڑھ جائے اور بہت زیادہ گہرا ہو جائے۔ تب جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر لیتی ہے ـــــ کیا میرا عشقیہ کلام آپ کو یہ احساس کراتا ہے کہ جنسیت اپنی تمام کثافتوں سے پاک ہو کر میرے شعور اور کردار کا جزوِ لطیف بن گئی ہے۔

معاف کرنا میں نے اس خط میں خواہ مخواہ "خطیبانہ رنگ" اختیار کر لیا آپ بھی تو بعض اوقات ایسی الٹی سیدھی باتیں کر دیتے ہیں جو ہم نازک مزاجوں پر گراں گذرتی ہیں۔ اگر آپ پر میرا یہ لکھنا گراں گذرا تو آپ سے معذرت

چاہنے میں بھی لطف آئے گا۔

یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے لاہور بلائیں اور میں نہ آؤں۔ البتہ جوش کا وعدہ میں نہیں کرتا۔ آپ اُن سے براہِ راست خط و کتابت کریں میں بھی لقمہ دے دوں گا۔ اور آپ کس کس کو بلا رہے ہیں؟

آپ کا
فراق

۳

۴ بینک روڈ۔ الہ آباد
یکم مارچ ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم

آپ کا طویل خط ملا، شکر ہے کہ آپ دو سطری اشاروں سے تو نکلے، یا تو قائل ہو جیئے یا کیجیئے، بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ صاحب میں آپ کی الٹی سیدھی باتوں پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں، میری باتوں پر بیشک ایمان نہ لائیے۔ لیکن مجھے قائل کرنے کی کوشش نہ کیجیئے، ورنہ میں آپ کے جوابوں میں الجھ جاؤں گا۔ اور بات آگے نہ بڑھ پائے گی اور پھر آپ مجھے یہ طعنہ دینے بیٹھ جائیں گے کہ میں الفاظ کے جادو سے قائل کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ایڈیٹروں کو تو خدا بھی قائل نہیں کر سکتا (خدا کا لفظ محاورے کے لیے لایا ہوں اور میں تو ایک شاعر ہوں)

اچھا ان باتوں کو چھوڑیئے اور یہ دیکھئے کہ مجھے پچھلے خطوں میں اپنے نفسیاتی تجزیہ کی دیانتدارانہ کوشش میں ہفت خوان طے کرنا پڑا کہ نہیں جنسیت شہوانی تلذذ، عشق انسانی بہبودی اور ترقی، انسانیت کا صحیح نظریہ یا یوں کہئے کہ عشقیہ دلچسپیوں کے ساتھ غیر جنسی اور غیر عشقیہ اہم امور و مسائل میں دلچسپی ان تمام چیزوں اور رجحانات یا محرکات کو اپنے کردار میں سمونا اور اتنے مختلف اجزا کو اپنے اندر جذب کر کے اپنی شخصیت کی ایک پوری اکائی بنانا، ان مختلف اجزا میں ہم آہنگی پیدا کرنا یہی میری کوشش رہی ہے۔ اس خط میں پہلے میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میری علمی، فلسفیانہ، سماجی اور سیاسی دلچسپیوں نے میری عشقیہ شاعری پر کیا اثر ڈالا ۱۹۳۶ء کے قریب میرا رجحان اشتراکیت کی طرف ہونا شروع ہوا۔ لیکن جیسا پہلے خط میں عرض کر چکا ہوں، لڑکپن ہی سے حسن پرستی کے ساتھ ساتھ اور اس سے ملی ہوئی میرے اندر کچھ اور صفتیں بھی تھیں۔ یعنی زندگی کی اعلیٰ قدروں، نیکی، خلوص، ہمدردی، شرافت، انسانیت دوستی، علم پرستی، حقیقی عظمت پرستی اور بعد کو اشتراکیت کا علم ہونے کے پہلے سے سچی وطن پرستی اور ہندوستان کی آزادی، ہندوستان کی عظمت کا احساس یہ تمام چیزیں میرے اندر کارفرما تھیں، اس لیے شروع ہی سے میری عشقیہ شاعری میں یہ تمام محرکات و اقدار اس طرح کارگر ہوتے رہے کہ عشقیہ جذبات میں شرافت اور تربیت یافتہ انسانیت کے عناصر گھل مل جائیں۔ جنسیت یا عشق اگر محض جنسیت وعشق ہیں۔ تو تھوڑی سی اچھی عشقیہ

شاعری کو یہ جنم دے سکتے ہیں۔ لیکن بلند عشقیہ شاعری اُس آدمی کے لیے ممکن نہیں ہے، جو نری جنسیت یا نرے عشق تک اپنی دلچسپیاں محدود رکھتا ہے۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو ہندوستان میں نشاۃ ثانیہ اور نئی شاعری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہر بیدار مغز روشن خیال ہندوستانی کی زندگی محض انفرادی دلچسپیوں کی حدیں توڑ رہی تھی اور یہ عمل عشقیہ شاعری پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ قومی زندگی میں ایک بڑا پن آنے لگا تھا۔ داغؔ اور امیرؔ کا انحطاطی دور مٹ رہا تھا۔ خود میری زندگی میں عشقیہ محرکات کے ساتھ ساتھ جو دوسرے اچھے محرکات تھے اور قومی زندگی میں جو نئے اقدار پل رہے تھے۔ ان دونوں نے مل کر میری عشقیہ شاعری کو پروان چڑھایا۔ پھر ۱۹۳۶ء سے اشتراکی فلسفہ نے میرے عشقیہ شعور اور میری عشقیہ شاعری کو نئی وسعتیں اور نئی معنویت دی۔ یہ حقیقت دہرانے کی ضرورت ہے کہ صرف جنسیت زدگی اور عشق زدگی نہ جنسیت کو چمکا سکتی ہے نہ عشق کو اور نہ عشقیہ شاعری کو۔ عشق اُس وقت عشق بنتا ہے جب عاشق محض عاشق نہ ہو بلکہ کافی حد تک ایک مکمل انسان ہو۔ میں نے یہ محسوس کیا۔ کہ میری عشقیہ شاعری میں اور اُردو کی پچھلی چوتھائی صدی کی شاعری میں قومی زندگی کی بیداری نئی توانائیاں اور نئے امکانات پیدا کرتی جا رہی ہے۔ لوگ ترقی پسندی کو بلند پایہ اور موثر عشقیہ شاعری کا دشمن غلطی سے سمجھ بیٹھے تھے، اجازت دیجئے کہ میں یہاں اپنے کچھ عشقیہ اشعار پیش کروں۔

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ — ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے — اُسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اٹھے ہیں چراغ

فرشِ میخانہ پہ جلتے چلے جاتے ہیں چراغ
دیدنی ہے تری آہستہ روی اے ساقی
خاک میں چوٹ دبی تھی یہ نہ جانے کب کی
رگِ پیمانہ لہو دینے لگی اے ساقی

زندگی کو بھی منہ دکھانا ہے — رو چکے تیرے بیقرار بہت

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوصِ سراپا ہے آج بھی

ہر گردشِ چشم آئینۂ گردشِ دوراں — ہر ایک ادا موجِ شرابِ طرب انگیز
آغازِ تعارف ہی میں صد قربتِ پنہاں — پہلی ہی نگاہوں سے عیاں الفتِ دیرینہ
موسیٰ فگن انداز سے اُن ہاتھوں کا اُٹھنا — ہیں صاعقۂ طور ترے ساعدِ سیمیں
وہ ہر نفسِ حسن میں خوشبوئے محبت — وہ رنگِ گل افشانیٔ لبہائے نگاریں

خوفِ طوالت سے میں اپنی عشقیہ جالیاتی ۔ رباعیاں یا نظمیں پیش نہ کروں گا۔

اور نہ غزلوں سے زیادہ اشعار کی مثالیں دوں گا۔ لیکن مندرجہ بالا اشعار پر اگر آپ غور کریں گے تو دو حقیقتیں کھل جائیں گی۔ پہلی حقیقت یہ ہے کہ ان میں کوئی سماجی سیاسی یا کوئی غیر عشقیہ یا افادی خیالات یا عناصر نہیں ہیں۔ یہ ٹھیٹ یا سو فیصدی عشقیہ شاعری ہے لیکن بغیر علمیٔ اخلاقی اور سیاسی محرکات کے یہ عشقیہ شاعری ممکن بھی نہیں۔ جنسی عشق، زندگی کی دوسری دلچسپیوں سے دست بردار ہو کر یا گریبان پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جانے کے بعد یا تو جنون میں مبتلا ہو جائے گا، یا نامرد ہو کر رہ جائے گا۔ ہمارے اُردو شعراء جسمی لحاظ سے نامرد نہیں تھے، لیکن چونکہ زیادہ تر یہ شعراء وسیع دلچسپیاں نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان کی عشقیہ شاعری میں وہ قوت یا زندگی نہیں ہے، جو ان شعراء کی عشقیہ شاعری میں ہے، جو حیات و کائنات میں بھی دلچسپی رکھتے تھے، مثلاً میرؔ، آتشؔ، غالبؔ۔

تو عشقیہ شاعری میں میری کوشش یہ رہی ہے۔ کہ شرافت وصداقتِ جذبات کے ساتھ ساتھ اشاریت کیفیت ہمہ گیری، داخلیت ومعنویت تخلیق فضا اور زبان وبیان میں ایک عالمگیر لہجۂ انسان کے دل کی دھڑکنیں اور ایک آفاقیت پیدا کر سکوں۔ فنی محاسن اگر آئیں تو انھیں صفات اور مقاصد کو اُجالنے اور چمکانے کے لیے آئیں۔ دنیا بھر کا عشقیہ ادب ہر مرتبے کا ہے معمولی، اوسط درجے کا اور بلند مرتبہ، آخرالذکر آفاقی ادب سے استفادہ کرنا بھی میرا مقصد رہا ہے اور اس طرح

عشقیہ شاعری کے لہجے میں زندگی، بلندی اور پاکیزگی پیدا کرنے میں مجھے کافی مدد ملی ہے۔ شخصیت اور شاعری صرف اپنے بوتے یا اپنے سہارے ہرگز بلند نہیں ہو سکتیں۔ دونوں بلندیاں اخذ کرتی ہیں تہذیبِ انسانی سے، ہر شخص کی بلند شخصیت اور ہر شاعر کی بلند پایہ شاعری دوسروں کی دین ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ہر خاص و عام اس دین کو حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

میں نے اپنی عشقیہ شاعری میں ایک اور قیمتی عنصر سمونا چاہا ہے۔ اور وہ ہے حیات و کائنات پر مکمل ایمان۔ میرے لیے اس کی بالکل ضرورت نہیں تھی کہ خدا پر پہلے ایمان لا کر فطرت یا خلقت پر ایمان لاؤں۔ یوں تو میری عشقیہ شاعری میں دکھ، درد، غم، آنسو، اضطراب، ناکامی سبھی کچھ ہے، لیکن اثر اس شاعری کا حیات و کائنات سے بیزاری نہیں ہے، بلکہ حیات و کائنات پر ایمان کو تقویت پہنچانا ہے۔ تصوف کا سہارا لیے بغیر مجازی دنیا کی پاکیزگی اور خیر و برکت کا احساس کرانا میری عشقیہ شاعری کا مقصد رہا ہے حقیقت جسے حقیقت کہتے ہیں۔ وہ میرے نزدیک اسی مجازی دنیا کا ارتقاپذیر وجود ہے۔ البتہ اب سے بیس برس پہلے تک عینیت اور تصوف کا کچھ اثر مجھ پر ضرور رہا ہے، لیکن عنصری کائنات کی طہارت و پاکیزگی کا براہِ راست احساس میرے اندر ہمیشہ رہا ہے۔

بہت اچھا جب لاہور آؤں گا۔ تو آپ مجھ سے باقی باتیں پوچھ لیجیے گا یہ خطوں کا سلسلہ بڑا دردِ سر ہے۔ جوش صاحب لکھنؤ کے مشاعرے میں آئیں گے

تو میں بھی اُن سے بات کروں گا۔ بات کیا کروں گا۔ بلکہ بات پکی کروں گا۔
آپ نے اندازیے کے سلسلے میں جو رقم بھجوانا تھی، وہ اب تک نہیں پہنچی۔ براہِ کرم اس کا بطورِ خاص خیال رکھیں۔

آپ کا
مشتاق

۴

۵/۴ بینک روڈ، الہ آباد
۳-جولائی ۱۹۵۳ء

برادرم-تسلیم

آپ نے اپنے خط میں یہ کیا لکھ دیا کہ میں نے عشقیہ شاعری کے پردے میں بعض بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ اگر آپ کے خیال میں میں نے بہکی بہکی باتیں کی ہیں۔ تو آج ذرا کھُل کر باتیں سُن لیں، تاکہ میرا یہ بہکنا مجذوبانہ حد تک بے مثال بن جائے ——— یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ میں جنسی موضوعات پر آکر پھیل جاتا ہوں۔ بلکہ میں بعض اہم حقیقتوں پر آزادانہ اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔

اچھا تو سنئے۔ آغازِ شباب سے لمبی زندگی پانے والوں کی بھی عشقیہ یا جنسی زندگی زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر برس تک قائم رہ سکتی ہے۔ یعنی ۸۰ یا نے

برس کی عمر تک۔ اس دوران میں کسی شخص کے جتنے بھی محبوب و معشوق ہوں۔ اُن سے
دہ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار بار مل سکے گا۔ یعنی زیادہ سے زیادہ تین چار سو
معشوقوں سے۔ سوچنے کی بات یہ ہے، کہ جنسی زندگی کا عملی حصّہ یعنی بوس وکنار،
وصل وہجر، شکر و شکایت، وفا جفا، انتظار، نامہ و پیغام اور اسی قسم کی مٹھی بھر
باتیں عشقیہ زندگی کے اخیر تک قائم رہتی ہیں، لیکن انہیں مٹھی بھر باتوں سے عشقیہ
شاعری ایک ہی شخص کے ہاتھوں ہزارہا عشقیہ اشعار کہلوا لیتی ہے۔ مجھے انگریزی
شاعر کیٹس (Keats) کے ایک خط کی یاد آگئی کہ جس طرح ایک مکڑی دیوار
کے دو تین نقطوں سے جالا بننا شروع کرتی ہے اور ہزارہا تار اور حلقے بنا لیتی ہے
اسی طرح شاعر ان گنے تجربوں کے سہارے ایک پورا ایوان عشق کھڑا کر دیتا ہے۔
یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ زیادہ تر حالتوں میں کسی عاشق کے معشوقوں کی تعداد
دو تین ہی زندگی بھر میں ہوتی ہے اور ان معشوقوں سے دو چار بار ہی وہ زندگی بھر میں
مل پاتا ہے اور ان دو چار سو ملاقاتوں میں وہی مٹھی بھر باتیں اپنے کو دہراتی رہتی ہیں آئے دن نئی
واردا تیں نہیں ہوتیں۔ اور دیوان تیار ہو جاتا ہے۔ ہزاروں اشعار کا۔ اگر یہ تجربے
نثر میں لکھے جائیں (اور افسانے کا سہارا نہ لیا جائے) تو شاید چالیس پچاس صفحات
میں سب باتیں بیان ہو جائیں گی۔ لیکن یہ شاعری کا جادو ہے کہ ایک ایک بات اور
واردات ہزار ہزار بار جنم لیتی ہے۔ یہ تکرار و تجدید جذبۂ عشق کے استقلال سے پیدا ہوتی

ہے۔ مجمول لذت پرستی تخیل کی مدد سے قریب قریب لامحدود خلاقانہ صلاحیت حاصل کر لیتی ہے۔ اب اگر سارا دیوان محض چوما چاٹی سے بھرا ہوا ہو تو ماننا پڑے گا کہ شاعر کی زندگی و ذہنیت ناقابلِ اصلاح ہوس کاری کی شکار رہیں، لیکن اگر واقعی کسی کا دیوان لطیف، پاکیزہ، رنگین، پُرمعنی عشقیہ جذبات اور جمالیاتی احساس سے مالا مال ہے تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاعر کی جنسیت عشق کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ وہ عشق بھی محض شاعر کے کردار کا مستقل جزو نہیں بن گیا ہے، بلکہ شاعری کے روپ میں رنگارنگ انداز سے جلوہ گر ہوا ہے اور خلاقانہ خلوص ہی ایسا کرا سکتا ہے ؎

تو ایک تھا مرے اشعار میں ہزار ہوا
اس اک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

اس خلاقی کا کیا راز ہے؛ چند محدود تجربے اور یادیں ہزاروں نئے روپ کیسے دھار لیتی ہیں، یہ ذرا پیچیدہ سوال ہے شاید بات یہ ہے کہ داخلی کیفیات یا کوئی داخلی کیفیت 'گننے' کی چیز نہیں ہے۔ جسے ہم ایک جذبہ کہتے ہیں۔ جب وقوف یا ادراک اُسے چھوتا ہے۔ یعنی جب جذبہ علم جذبہ بنتا ہے تو اس کے بے شمار پہلو نظر آنے لگتے ہیں۔ اس طرح وحدت سے کثرت پیدا ہوتی ہے، ہر حقیقت ایک سوتی ہوئی بھی کئی حقیقتیں بن جاتی ہے۔

ایک عاشق کی جنسی زندگی گویا اس کے جنسی اعمال کو بے تہ اشخاص بدکاریوں اور غلط کاریوں سے تعبیر کرتے ہیں ؎

زغے میں آگیا عشقِ اعظم
ٹوٹ پڑے دنیا کے کمینے

ازل کی صبح سے اُس عشق کا نہ راز کھلا
جو شہر شہر ہے بدنام کُو بہ کُو رُسوا

یہ راز اگر کہیں کُھلتا ہے تو حقیقی عشقیہ شاعری میں کُھلتا ہے یا عاشق کی زندگی کے اُن پہلوؤں اور کارناموں میں کُھلتا ہے۔ جن کا سررشتہ لوگ جنسی یا عشقی زندگی سے مِلا نہیں پاتے۔

جنسیت کا خواہش یا حاجت روائی کی سطح سے اُبھر کر ایک مستقل جذبے کی شکل اختیار کر لینا، اس میں ارتقائے حیاتِ انسانی کا کونسا مقصد نہاں ہے؟ ——— بقائے نسل کے لیے تو جنسی خواہش یا ایک خواہش مردار کافی ہے۔ عشق کس مد میں آتا ہے؟ مجھے تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے، کہ ایک عظیم تہذیب میں عمل کی وسعتیں اور اس کے لیے بے شمار پہلو مستقل عشقیہ جذبات کی دین ہیں ؎

انسان کو محض کھاتے پیتے گذرے اس منزل سے وہ پاؤں آگے نہ دھرے
وحشی کے عمل کی انتہا صیدِ شکار گر عشق نہ ہو عمل ترقی نہ کرے

عشق کی خلّاقی محض شعر و شاعری، رقص و سرود، تاج محل اور اجنتا یا دیگر فنونِ لطیفہ تک محدود نہیں، بلکہ تہذیب کا پُورا کارنامہ اُس جنسیت کی تخلیق ہے، جو

عشق کا مرتبہ حاصل کر چکی ہے۔ اب سوال اُٹھتا ہے کہ کارآمد عمل یا افادیت سے شاعری اور دوسرے فنونِ لطیفہ کا کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ کیا یہ فنون تاریخ کے مقاصد کی تکمیل میں مدد ہوتے ہیں، یا ان مقاصد سے الگ تھلگ چیز ہے؟ کیا وجدان محض برائے وجدان ہوتا ہے یا برائے عمل؟

خطرہ تو اس کا ہمیشہ رہتا ہے، کہ فنونِ لطیفہ آپ اپنے شکار ہو کر رہ جائیں اور نظرِ حال وقال ہو کر رہ جائیں، لیکن شاعر اور اس کے سماج کی بیدار مغزی اس خطرے سے شاعری کو محفوظ رکھ سکتی ہے ؎

اے شاعرِ خوش نوا تری ہے وہ ذات — جو سوئی ہوئی جوت جگائے دن رات
اپنی ہی لذّتِ بیاں میں نہ ہو گم — دم بھر نہ چھٹے منصبِ نقادِ حیات

حقیقی شاعرانہ وجدان محض کائنات کے وجود کے احساس سے نہیں پیدا ہوتا، بلکہ اس وجود کے سچّے علم اور اُسے سچی طرح سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس وجود کا سچا ادراک اس راز کا انکشاف کرتا ہے کہ وجودِ کائنات ہر لحاظ سے ایک متحرک اور تغیّر پذیر وجود ہے، کائنات کی تخلیق ہو نہیں چکی بلکہ ہوتی جارہی ہے اور اس مسلسل تخلیق کا ضامن آدمی کی ذات ہے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب سے سینکڑوں برس پہلے کی شاعری کے مشاہیر نے اپنے زمانے کی کائنات کو جس طرح سمجھا تھا وہ کائنات تو اب بدل چکی اور وہ کائنات ہمیں واپس دی جائے تو ہم اسے کوڑیوں کے مول بھی نہ

خریدیں۔ لیکن والمیک، ہومر، ورجل، کالی داس، فردوسی، حافظ، تلسی داس اور شکسپیئر کے کارنامے اب بھی سدا بہار بنے ہوئے ہیں۔ ان شاعروں کی دنیا لینے سے ہمیں انکار ہے اور ان کے کارنامے کھو دینے سے بھی ہمیں انکار ہے۔ یہ اس لیے کہ ماضی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک وہ پہلو جو حال و مستقبل میں اپنی ہیئت کو تبدیل کر کے قائم رہے گا، دوسرا وہ پہلو جو اب قائم نہیں ہے۔ شاعر ماضی کے دونوں پہلو زندۂ جاوید شکل میں پیش کر دیتا ہے۔ اور جس ماضی سے ہم ابھرتے ہیں اُس کا زندہ شعور ہمارے اندر پیدا کر کے ہماری بدلتی ہوئی زندگیوں کا تسلسل محفوظ کر دیتا ہے یعنی ماضی کی زندہ روایتوں کی روح کو محفوظ کر دیتا ہے۔ ہم ماضی لے کر کیا کریں گے لیکن ہم ماضی کی معنویت سے اگر چشم پوشی کریں تو حال کو بھی کھو بیٹھیں گے ہمیں حال کو ماضی نہیں بنانا ہے، لیکن حال اور ماضی میں جو رشتہ ہے اُسے سمجھنا از حد ضروری ہے۔ اگر ماضی کا ادب، عالیہ سب کا سب فنا ہو جائے تو ہمیں حال و مستقبل کی تعمیر میں بہت سی رکاوٹیں پڑیں گی۔

آپ کے مضمون پڑھتا رہتا ہوں، تعریف اس لیے نہیں کرنا چاہتا کہ کہیں آپ اکڑنے نہ لگیں۔ اور یوں ہم اچھے مضامین سے محروم ہو جائیں۔

اور آخری بات یہ کہ خفا ہونا چھوڑ دیجیے۔ اتنے ثقہ آدمی ہوتے ہوئے جب آپ بچّوں کی طرح رُوٹھ جانا چاہتے ہیں۔ تو بڑا عجیب لگتا ہے فراق اور مشین میں تھوڑا سا فرق تو ہے، بہر حال غزل حاضر ہے اور اسلامی ادب

کے بارے میں بھی چند سطور نذر ہیں۔ یہ آپ کے ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب کو کیا ہو گیا ہے۔ پہلے تو اچھے بھلے تھے، اب تو ان کی بیماری لاعلاج معلوم ہوتی ہے۔
پچھلے دنوں سخت بیمار رہا ہوں۔ اس لیے جلد جواب نہ دے سکا۔ مجبوری تھی۔

آپ کا
فراق

۵

۴/۴ بنیک روڈ، الہ آباد
۱۷ ر جولائی ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم

آج میں آپ کو بڑا معقول قسم کا خط لکھنا چاہتا ہوں، موضوع تو آپ کا ہے، لیکن لکھوں گا تو میں، کئی دنوں کے بعد آج طبیعت سنبھلی ہے، اگر قلم بھی سنبھل سنبھل کے چلا تو مجھے وہ لطف نہ آسکے گا جو قلم کے پھسلنے میں ہے۔ بہرحال مسئلہ بڑا نازک سا چھیڑ رہا ہوں۔ وہ یہ کہ میں اپنی شاعری سے خوش ہی خوش ہوں یا کسی قدر ناآسودہ بھی ہوں، میں معقول و مناسب حد تک اپنے کلام کے اُس حصّہ سے آسودہ و مطمئن ہوں، جسے میں اچھا سمجھتا ہوں لیکن اپنے کسی شعر، غزل، رباعی یا نظم کو حرفِ آخر نہیں سمجھتا۔ میرؔ، غالبؔ، آتشؔ، اقبالؔ تک کے بلند ترین کلام کو میں اُردو شاعری کا حرفِ آخر نہیں تسلیم کرتا۔ اپنے کلام کے جن حصّوں کو میں غیر معیار

ہو کر پسند کرتا ہوں، اُن کی بھی مختلف سطحیں ہیں مختلف قدریں اور مختلف رُتبے۔
میرا ہر اچھا شعر عظیم ترین شاعری نہیں ہے۔ لیکن کس شاعر کا اچھا شعر عظیم ترین شاعری ہے؟ میں جیسی اچھی اور جتنی اچھی شاعری کر سکا ہوں، اس سے کہیں اچھی شاعری کا تصور کر سکتا ہوں۔

اگر مجھے اپنے پورے کلام پر نظرِ ثانی کرنے کی فرصت ملی (میں اس فرصت کو پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں) تو میں اپنے بہت سے اشعار کو اور بھی چمکا دینے کی امید رکھتا ہوں۔ خاص کر غزل کے اشعار اور اپنی بہت سی رباعیوں کو انھیں پھر سے چھُونے کی ضرورت ہے۔ (They need retouching)
ابھی میرے تحت الشعور میں سینکڑوں اور غزلیں اس طرح گنگنا رہی ہیں کہ میں گنگناہٹ سن نہیں سکتا۔ صرف ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرے اندر ایک گنگناہٹ سی ہو رہی ہے اور بس۔

اپنی نظموں کے بارے میں، میں یہ محسوس کرتا ہوں مجموعی طور پر اُن میں کئی خوبیاں ہیں، لیکن جتنی اچھی نظمیں میں کہہ سکا ہوں۔ ان کی دس گنی تعداد یا مقدار میں نظمیں کہنا چاہتا ہوں۔ میری دو نظمیں ادبی اور تعلیم یافتہ حلقوں میں بہت سراہی گئیں۔
اگرچہ یہ دونوں نظمیں غیر مقفیٰ ہیں۔ لیکن آپ کے حضرتِ جگر مرادآبادی ایسے سراپا غزل شاعر اور حضرتِ جوش ملیح آبادی جیسے سراپا نظم شاعر نے بار ہا اُن پر وجد کیا، اور جی کھول کر داد دی۔ اور اگرچہ ان نظموں میں کوئی کھلا ڈھلا مقصد نہیں ہے

بلکہ صرف منظر نگاری اور تخلیقی فضا سے پھر بھی علی سردار جعفری اور اُن کے ہمنوا وہمعصر شعراء نے جی کھول کر اُن کی داد دی۔ یہ دو نظمیں ہیں! "آدھی رات" اور "پرچھائیاں"۔ اکثر خیال آتا ہے کہ اس انداز میں کم از کم دس نظمیں اور ہوں۔ میری ایک اور نظم ہے "رقصِ شباب" جسے میں بہت اچھی جمالیاتی نظم سمجھتا ہوں اور جو اُردو کے تمام مشاہیر سے داد حاصل کر چکی ہے، دو چار ایسی اور نظمیں کہنا چاہتا ہوں، اپنی ترقی پسند نظموں میں "داستانِ آدم"، "روٹیاں" اور کچھ دوسری نظمیں مجھے پسند ہیں، میں ان سے بھی بلند تر انداز کی پچاس اور نظمیں کہنا چاہتا ہوں۔

میں نہ تو اقبال، جوش، چکبست کی تقلید کرنا چاہتا ہوں (اگرچہ اُن کے محاسن کلام کا مجھے اعتراف ہے) نہ یورپ کے شعراء کی سو فیصدی تقلید کرنا چاہتا ہوں، لیکن پروفیسر کلیم الدین احمد کے اس بیان سے متفق ہوں کہ اُردو کی نظمیں بھی غزلیت زدہ ہیں، میں چاہتا ہوں کہ ورڈسورتھ، کیٹس، شیلے، کولرج، ٹینی سن، میتھو آرنلڈ، سون برن وغیرہ شعراء کے اسلوب اور تکنیک میں جو خلاقانہ صلاحیتیں ملتی ہیں اور گھلاوٹ اور نغمگی کے ساتھ جو سنجیدگی ملتی ہے اُس نمونے کی کچھ نظمیں کہہ سکوں، کچھ ایسی نظمیں کہہ بھی چکا ہوں۔

ہمارے نئے شعراء غیر مقفیٰ نظم میں جو کوششیں کر رہے ہیں۔ میں اُسے سراہتا ہوں لیکن مقفیٰ شاعری کے امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے۔ انگلستان کی شاعری اُردو شاعری سے بہت پرانی ہے لیکن آج تک اس میں رنگا رنگ مقفیٰ شاعری ہو رہی

ہے۔ اگرچہ انگریزی شاعری کے جنم دن سے اُس میں غیر مقفیٰ نظم (Blank Verse) داخل ہو چکی تھی۔ انگریزی کے مشہور ode ایسی چیزیں جنھیں ہم اپنی مقفیٰ شاعری کے لیے نمونے بنا سکتے ہیں۔

اپنی شاعری کی خوبیوں اور اس میں جو کمی محسوس کرتا ہوں اُس کے بارے میں میں اظہارِ خیال کر چکا۔ اس دور کے شاعروں سے گذارش کروں گا کہ وہ انیسویں صدی کی مغربی شاعری کا بغور مطالعہ کریں اور قدیم مشاہیرِ اُردو کے کلام کو بار بار پڑھتے رہیں۔ قدیم ادب سے استفادہ کیے بغیر کام نہ بنے گا۔ لیکن قدیم ادب کا شکار ہو جانے سے بھی کوئی کام نہ بنے گا۔ محاورے، روز مرہ، فصاحت، ٹکسال، اور وہ دیگر محاسنِ شعری جن کے نمونے قدما پیش کر چکے ہیں۔ انھیں نظر انداز کر کے ہمارے نئے شاعر کہیں کے نہ رہیں گے۔ ہاں نئے اسلوب ضرور پیدا کیے جائیں، روایتوں کی زنجیریں ضرور توڑی جائیں، لیکن جو کُلیے شاعری کو زندگی بخشتے ہیں اُن کا ضرور لحاظ رکھا جائے ــــ محض نئی بات کہہ دینے سے یا نئے اندازِ بیان سے یا چونکا دینے والی بات کہہ دینے سے شاعری زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری شاعری محض مختلف افراد کے دماغوں کی اُپج رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ نئی شاعری جبھی زندہ رہے گی۔ جب وہ ہماری تہذیب اور ہمارے قدیم ادب کی دین ہو جس اپنی شاعری کو اپنے اور دنیا کے قدیم مستند ادب کا سہارا لے کر نیا بنانا ہے۔ ایک بات اور عرض کر دوں۔ انگریزی کے ایک بڑے ادیب کا مقولہ ہے

کہ عظیم ادب شاذ ہی ادبی ہوتا ہے (Great literature is seldom
literary) میں شروع ہی سے ادب کو ادبی زبان دینے کے بدلے زندگی
کی زبان دینے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ زبان دانی کا حقیقی مفہوم ہے —
حیات دانی وحیات شناسی۔

آپ کا
فراق

۶

۸/۴ بینک روڈ، الہ آباد
۵ راگست ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم

اس خط میں اُن مباحث پر مزید روشنی ڈالنے کی کوشش کروں گا، جو میرے پہلے خطوط میں زیرِ غور رہے ہیں۔ اور میں آپ کی ان باتوں میں نہ الجھوں گا جن میں آپ نے اڑنگے لگائے۔ بس میری باتوں کو چپکے سے سنتے جائیے، جب آج سے پہلے کا ادب موجودہ تہذیب کا ایک زندہ جزو بن چکا ہے تو یہ امر لازمی ہو جاتا ہے کہ ہر نمک حلال شاعر قدما سے اپنے مزاج و صلاحیت کے مطابق استفادہ کرے۔ میں نے اُردو اور دوسری زبانوں کی اچھی شاعری سے بہت کچھ حاصل کیا ہے لیکن میں نے یہ کبھی نہیں چاہا کہ میں میرؔ، غالبؔ، نظیرؔ اکبرآبادی، آتشؔ، اقبالؔ،

جوشؔ یا کسی بھی مشہور اُردو شاعر کا جلیع دوم بن کے رہ جاؤں، میرا یقین ہے کہ اگر میرے کلام سے تمام مقطعے کاٹ دیئے جائیں اور دوسرے مشاہیر اُردو کے نمائندہ کلام سے ان کے مقطعے کاٹ دیئے جائیں اور ان سب کو گڈمڈ کر کے ایک پلندہ بنا دیا جائے، تو اہلِ نظر حضرات اس بے نام و تخلص پلندے میں سے میرا اور دوسرے شعرا میں ہر ایک کا کلام الگ الگ کر لینے میں قریب قریب سو فیصدی کامیاب ہو جائیں گے، لیکن اگر دورِ حاضر یا گذشتہ ادوار کے دوم اور سوم مرتبہ کے شعرا کا کلام اسی طرح گڈمڈ کر دیا جائے اور نواب جعفر علی خاں اثرؔ کے مجموعہ "بہاراں" کی غزلوں سے مقطع کاٹ کر اس دوم اور سوم درجے کی شاعری کے پلندے میں ملا دی جائیں تو ان شعرا کے کلاموں کو الگ الگ کرنے میں کسی کو کامیابی نہ ہو گی۔ کمزور شاعری خواہ اُسے کتنا ہی رچایا اور سنوارا جائے۔ خط و خال اور شخصیت سے محروم رہتی ہے، لیکن یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ میرؔ و غالبؔ سے کم حیثیت کا شاعر صاحبِ طرز نہیں ہو سکتا۔ جرأتؔ و ناسخؔ، میرؔ و غالبؔ سے بہت کم تر ہیں۔ لیکن جرأتؔ و ناسخؔ دونوں صاحبِ طرز ضرور ہیں۔ اب اگر کوئی شاعر دوم سوم درجہ کی شاعری کرتا ہوا بھی ایسی کمزور شاعری کرتا ہے کہ اُس کا کوئی اپنا رنگ نہ بن پائے، اس کی شاعری میں نمایاں خط و خال نہ پیدا ہوں جن میں اس شاعر کا کوئی شریک نہیں تو اس شاعری کو ہم جان تو سکتے ہیں لیکن اُسے نہ ہم مان سکتے ہیں نہ پہچان سکتے ہیں۔

میں نے ارادتاً اس کی کوشش نہیں کی کہ اپنے طرزِ کلام کی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناؤں۔ اگر میرے کلام کا ایک نمایاں اور مخصوص رنگ ہے اور ایک مخصوص طرز ہے تو یہ امتیازات میری شاعرانہ شخصیت سے میرے کلام میں داخلی طور پر پیدا ہوتے گئے" البتہ میری شاعری کے آغاز سے پانچ سات برس تک جسے دورِ تجربہ کہہ سکتے ہیں' میرے کلام میں تقلید کا عنصر قدرے زیادہ ہے اور میری اپنی آواز ذرا دبی دبی سی ہے۔

لیکن جیسا عرض کر چکا ہوں ایک مخصوص رنگ اور نمایاں خط و خال دوم سوم درجہ کی شاعری میں بھی پائے جا سکتے ہیں۔ بلند مرتبہ شاعری یا وہ شاعری جسے ہم ادبیاتِ عالیہ کہتے ہیں، اُس میں ایک منفرد شخصیت کے علاوہ فن اور زندگی کی اعلیٰ قدروں کا مرکزی جوہر ہے۔ حیات و کائنات کی عظمت' آفاقی وسعت' حیات و کائنات پر اٹل ایمان اور حیات و کائنات سے بیکراں محبت۔ یہ مرکزی جوہر عشقیہ شاعری اور دیگر موضوعات کی شاعری دونوں کو عظمت عطا کرتا ہے، آتش اور آتش کے شاگردوں کو لیجیئے۔ آتش کی استادی کا راز اُن کی زبان دانی طباعی، ذہانت، مضمون آفرینی میں اُس حد تک نہیں ہے جس حد تک آتش کے تفکر کی آفاقیت میں وہ راز پنہاں ہے۔ اور کلامِ آتش کی آفاقیت کے مزاج میں منطقی طور پر ممکن ہے کہ کئی موضوعات پر جو اور جس طرح آتش نے سوچا۔ اُسی طرح رند و صبا نے بھی سوچا ہو لیکن وہ موضوعات آتش کے وجدان میں اس سے

زیادہ دُور رس، مؤثر، پُرعظمت اور پُرکیف بن گئے۔ جتنا وہ رِند و صبا کے وجدان میں بن سکتے تھے۔ بلند شاعری فی الحقیقت جمالیاتی عظمت کی تلاش ہے۔

جنسیت اور عشق کے بارے میں بھی پہلے کے خطوط میں کئی باتیں کہہ چکا ہوں۔ آج یہ کہنا ہے، کہ بڑے عاشق کا عشق اتنا بڑا عشق نہیں ہوتا جتنا بڑے "انسان" کا عشق ہوتا ہے۔ بظاہر جنسیت محض جنسیت ہے لیکن شیکسپیئر، کالیداس، حافظ، گیٹے، دانتے کی جنسیت عوام کی جنسیت سے بہت بلند تر چیز ہے۔ عشق صرف دل کا معاملہ نہیں ہے بلکہ دل سے زیادہ دماغ کا معاملہ ہے۔ چھوٹے دماغ کا آدمی بڑے سے بڑا عاشق ہو کر بھی کورا یا نرا عاشق ہوتا ہے، بڑا عاشق نہیں ہوتا، ایسا آدمی اگر معشوق پر مٹ مٹ جائے، اپنے شدّتِ خلوص سے وہ اپنے جسم کو چھلنی بھی کر ڈالے یا جنگلوں میں نکل جائے، یا معشوق کی خدمت کے لیے اپنی زندگی قربان کر دے، پاگل بھی ہو جائے، خودکشی بھی کر ڈالے یا جو کچھ کرے، بلند دل و دماغ والے عاشقوں کی برابری نہیں کر سکتا، خواہ آخرالذکر کوئی ڈرامائی یا غیر معمولی حالت اپنی نہ بنائیں اور کچھ ہنس کھیل کر واردات عشق کو برداشت کر لیں، وفا کے معجزے دکھانا بڑے عاشق کا کام نہیں ہے، یوں تو میرؔ نے کہا ہے ؎

پرستش کی اے بُت یہاں تک تری
نظر میں سبھوں کی خدا کر چلے

لیکن یہ پرستشِ در جاناں پر جبیں سائی یا رونے یا گڑگڑانے کا نام نہیں ہے
یہ ایک داخلی عمل ہے، اس داخلی عمل سے حسن کے اقدار کی تخلیق ہوتی ہے۔
جنسیت بجائے بقائے نسل کی ضامن ہونے کے ارتقائے تہذیب کی ضامن بن جاتی
ہے کسی مفکر کا بیان ہے کہ ایک تربیت یافتہ ناکام عاشق دیوتا معلوم ہوتا ہے
جو لوگ جنسیت کو عشق سے خارج کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ایسا
عشق ناکام ہو ہی نہیں سکتا۔ جب حسرت موہانی کہتے ہیں ؎

دیکھنا بھی تو انھیں دور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حسن کو رسوا کرنا

تو یہ افلاطونی عشق محض ایک برائے بیت چیز ہو کر رہ جاتی ہے' اور اس
دور سے دیکھنے میں بھی جو جادو کارگر ہے، وہ جنسیت ہی کا جادو ہے۔
یہی بات ہم افراد سے گذر کر قوموں اور تہذیبوں کے لیے کہہ سکتے ہیں۔
وحشی یا نیم مہذب قومیں اس کی مثالیں تو پیش کر سکتی ہیں۔ کہ ان کے کئی افراد جذبۂ عشق
کے تحت آگ میں کود پڑے لیکن ایسی قوموں کا عشق ان مثالوں سے بڑا عشق نہیں بن
جائے گا، البتہ قابلِ قدر عشق ضرور رہے گا، کیونکہ عشق کا مقصد معشوق سے وصال و
قرب کے علاوہ جذبۂ عشق اور احساسِ جمال کو بلند بنانا ہے اور آگے بڑھ کر تہذیب
و تمدن کی تخلیق کرنا ہے شیکسپیئر کی عشقیہ شاعری ملکہ الزبتھ کے زمانے کے غیر عشقیہ
عظیم کارناموں سے غیر متعلق نہیں ہے' شیکسپیئر کی شاعری، بیکن کی تصنیفات، نئی دنیا

کی وسیافت، انگلستان کی نشاۃ ثانیہ؛ یہ سب ایک ہی تاریخی عمل یا دور کی پیداوار ہیں، ہماری اُردو شاعری نے کسی بڑی قومی زندگی کے آغوش میں نہ جنم لیا تھا نہ پروان چڑھی۔ جیسا پہلے عرض کر چکا ہوں۔ خود میری شاعری میں اگر واقعی کچھ بڑی چیزیں ہیں تو وہ سب کی سب ایجادِ بندہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس ہندوستان کی دین ہیں جس کی نشاۃ ثانیہ راجہ رام موہن رائے کے وقت سے شروع ہو چکی تھی۔ جو عشقیہ شاعری ایک بڑی قومی زندگی اور ایک بڑی اور زندہ تہذیب کی پیداوار ہوگی۔ وہ قوم کے لیے چھوٹے حال قال یا محض تفننِ طبع کا باعث نہ بنے گی۔ بلکہ وجدان و تقدس کی ایک بڑی یونیورسٹی ہوگی، بڑی عشقیہ شاعری کی نگاہ میں جہاں ایک طرف معشوق ہوتا ہے وہاں دوسری طرف قومی زندگی اور اس کے امکانات ہوتے ہیں۔

ایک مسئلہ پر بھی اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں، معشوق ذہنی اور اخلاقی طور پر کوئی فوق الانسان نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک معمولی انسان ہوتا ہے ــــ تو کیا اُس کا اس قدر گرویدہ ہو جانا کہ اُس سے قیمتی انسان کا تصور بھی ناممکن ہو جائے ایک جھوٹ یا مبالغہ نہیں ہے ؟

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا

محبت کی مشہور داستانوں یا واقعوں کے معشوق اپنے زمانے کے حسین ترین انسان نہیں تھے لیکن ناقابلِ برداشت جنسی کشش عاشق میں پیدا کر دیتے تھے اور

غیرمعمولی دل و دماغ رکھنے والے دلوں میں دنیا کے حسین ترین انسان نظر آتے تھے۔ عقلی طور پر تو یہ ایک بھرم ہے۔ لیکن اس بھرم میں ایک راز پوشیدہ ہے اور وہ راز بقائے نسل نہیں ہے، بلکہ ارتقائے نسل ہے۔ بقائے تہذیب نہیں ہے بلکہ ارتقائے تہذیب ہے۔ معشوق کے جمال کی یہ داخلی کشش مجموعی حیثیت سے ایک بہتر نسل اور بہتر تہذیب کی ضامن ہے، جنسیت شدید جذبات کے سہارے بہتر نسل پیدا کرتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اگر کسی مرد اور کسی عورت میں انتہائی عشق ہو تو اولاد بہت بلند تر پیدا ہو گی۔ لیکن امکان بہتر اولاد پیدا ہونے کا ضرور ہے۔ اولاد کی ترقی میں سب سے زیادہ حصہ ماں باپ کی باہمی محبت ہے، اگرچہ اور چیزوں کا بھی اس معاملے میں حصہ ہے۔ پھر بھی والدین کی باہمی محبت بچے کی زندگی کو جنت بنا دیتی ہے، یعنی اُسے ترقی کے بہترین امکان فراہم کر دیتی ہے۔

لیکن ہمجنسوں کی پُرخلوص جنسی محبت سے اولاد تو نہیں پیدا ہوتی، پھر اس سے تہذیب کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ ایک فائدہ عاشق و معشوق کی زندگیوں میں ایک لطافت پیدا ہو جانا اور دونوں کی شخصیتوں کی تالیف و تہذیب۔ دوسرے اگر عاشق کی شخصیت معشوق سے بڑی ہے تو معشوق، جمالِ ہمنشیں در من اثر کرد، کے مصداق بہت کچھ بن سکتا ہے، بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ لیکن جیسے پہلے عرض کر چکا ہوں ہمجنسوں سے محبت اِنے گنے افراد ہی تک محدود رہے

تو اچھا ہے۔ پھر اگر ایسی محبت میں طرفین میں سے کوئی شاعر، فن کار یا کسی دوسری کارآمد دلچسپیوں کا حامل ہے تو یہ محبت اُس کی ان دلچسپیوں کا حامل ہے۔ تو یہ محبت اُس کی ان دلچسپیوں کو پروان چڑھانے میں بہت مدد دے سکتی ہے۔ یہاں بھی وہی بات کہی جاتی گی۔ ویسی چھچھورے آدمیوں کی امرد پرستی کو سقراط یا بہت سے گمنام لیکن شائستہ تہذیب یا شائستہ عشق عشاق کی امرد پرستی سے کوئی نسبت نہیں۔ ہر امرد پرست غنڈا یا شہدا نہیں ہوا کرتا اور نہ مخرب اخلاق ہوتا ہے۔ ایڈورڈ کارپینٹر کی تصنیفات اس نازک مسئلے پر بہت بصیرت افروز ہیں۔

دیکھئے میں ان خطوں میں کتنی محنت کر رہا ہوں، تاکہ آپ کو میری ذات اور میرے خیالات کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہوں، یہ بھی واقعہ ہے کہ میں نے آج تک کسی سے بھی اتنی کھُل کر باتیں نہیں کی ہیں، نہ جانے کیا بات ہے کہ مجھے آپ کی ہر بات کی تعمیل میں ذہنی سکون حاصل ہوتا ہے اب مجھے اپنی زندگی پر کوئی بھروسہ نہیں رہا، نہ جانے کب مرجاؤں، کافی عمر ہوگئی ہے، کب تک شعر کہہ کہہ کر جی سکوں گا، اور اب مجھے یہ امید بھی ہے کہ آپ میری زندگی میں یا میرے مرنے کے بعد ایک مضمون لکھ سکیں گے، جس سے میری بھرپور شخصیت سب کے سامنے آئے گی، کیا یہ کم میری زندگی کے بعد ہوگا، یا زندگی ہی میں۔

آپ کا
فراق

۷

۸/۴ بینک روڈ، الہ آباد
۱۶۔ اگست ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم

یہ آپ نے صحیح کہا کہ میں نے اُردو کو نئے الفاظ، نئی تشبیہات اور نئے استعارے دئے ہیں، لیکن میرا دل اتنا کچھ کرنے اور کہنے پر بھی مطمئن نہیں ہوا چاہتا ہوں کہ اُردو کے لیے وہ کچھ کر جاؤں جو اب تک کسی نے نہ کیا ہو۔ شعر میری زندگی ہے اور اُردو اُس کا ذریعہ۔ اس طرح اُردو میری زندگی ٹھہری، اور اپنی زندگی سے کسے محبّت نہیں ہوتی۔

میں اپنے ذاتی کردار اور کلام کے متعلق یہ کبھی نہیں سوچتا کہ "ایں چنیں دیگرے نیست" میں بسا اوقات اپنے کردار و کلام کا غیر جانبدارانہ اور سوجھ بوجھ

کے ساتھ جائزہ لینے کی کوشش کرتا ہوں اپنے کردار میں کئی کمزوریاں پاتا ہوں۔
بچپن ہی سے میں ایک مغلوب الغضب شخصیت و کردار کا اپنے آپ کو حامل پاتا رہا ہوں
بچپن ہی سے خاص موقعوں پر میرے اندر غصّے کا جوالا مکھی پھوٹ جایا کرتا تھا۔
میں مغلوب النفرت بھی اپنے آپ کو پاتا ہوں ــــ ٹگ بھگ ادھیڑ عمر تک تو میں
اپنی دونوں بدعتوں کو تکلیف دہ صفات سمجھتا ہوا بھی ان پر فخر کیا کرتا تھا جن لوگوں
میں غصّے کی کمی یا نفرت کی کمی پاتا تھا، انھیں میں اخلاقاً نامرد سمجھتا تھا۔
میرے اندر یہ نیم وحشیانہ صفات غالباً میری ماں کے اثر سے پیدا ہوئیں۔
لیکن میری ماں کا غصّہ کبھی کبھار کا ہوتا تھا۔ اور وہ بہت جلد اپنے غصّے کو بھول
جایا کرتی تھیں، مجھ پر غیظ و غضب کے دورے ذرا جلد جلد پڑتے تھے اور
میں ذرا دیر میں اپنا غصّہ بھولا کرتا تھا۔ شدّتِ ادراک و شدّتِ احساس کی
وجہ سے جو چیز بُری لگتی تھی، وہ ہر لمحہ میری نظر میں بد سے بدتر ہوتی جاتی
تھی۔ اگر یہ غصّہ ملازموں پر آیا تو میں گالی گلوج اور مار پیٹ تک اُتر آتا تھا۔ اگر
دوسروں پہ آیا تو قریب قریب خون اور قتل کر دینے کے جذبات سے میں بگلا اُٹھتا
تھا۔ میں اُن لوگوں تک سے نفرت کرنے لگتا تھا، جو غصّے کو بُری چیز کہتے تھے۔
غصّے کی بُرائی سن کر ہی مجھے غصّہ آجاتا تھا۔ اب تک میری کچھ ایسی حالت ہے
کہ چند اشخاص کے تصوّر ہی سے میرا جی چاہتا ہے کہ بُری طرح پیٹیں تاکہ اُن کی تمام
شرارتیں اور حرامزدگیاں دور ہو جائیں۔

میرے اندر سے مغلوب الغضب اور مغلوب النفرت ہونے کی خصوصیت سِنّ شعور تک پہنچتے پہنچتے یقیناً غائب ہو جاتی یا بہت کم رہ جاتی۔ اگر میری ازدواجی زندگی میرے لیے عذاب نہ ہوتی۔ سترہ برس کی عمر سے یعنی جب سے میری شادی ہوئی میرا وجود غصّہ اور نفرت کا ایک پکّا پھوڑا بن کر رہ گیا ہے۔ دوسری شادی کا حوصلہ نہیں رہ گیا تھا اور بیوی کو مستقل طور پر اس کے میکے بھیج دینا یہ بھی بڑا ظلم معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے ساتھ رہنا اور برابر غصّہ و نفرت، بے دلی اور بد دلی کے ساتھ جیتے رہنا میرے حصّے میں آیا۔ غور و فکر کے بعد میں کچھ کچھ یہ سمجھنے لگا اور اب تک سمجھتا جا رہا ہوں کہ غصّہ اور نفرت اگر دو افراد کے خلاف ہے تو اس سے سوائے اپنے آپ کو تکلیف پہنچنے کے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اگر میری شادی ایسی عورت سے ہوتی۔ جس سے میں کافی حد تک آسودہ ہوتا۔ کیونکہ تہہ دل سے اور اپنی مرکزی فطرت سے میں یہی چاہتا تھا، کہ دُنیا بھر کو اپنی محبّت سے نہلا دوں۔ ازدواجی زندگی سے شدید تلخی کی وجہ سے مجھے دوسروں سے محبّت کرنی پڑی، اگر یہ تلخی میری زندگی میں نہ آئی ہوتی تو اس سے کئی فائدے ہوتے، اُدھر خریدی ہوئی محبّت کا میں قائل نہ تھا۔ اور پیشہ ور طوائفوں کو چھوڑ کر بھلے گھر کی عورتوں سے بے تکلف ہو کر ملنا میرے زمانے میں قریب قریب ناممکن تھا۔

میں بتا چکا ہوں کہ میرے نزدیک جنسیت محض شہوت یا مباشرت

کبھی نہیں رہی، بلکہ ایک مکمل سازِ زندگی رہی ہے اس ساز کا مرکزی تار تو مہیب آوازیں پیدا کرتا رہا ہے، یعنی وہ تار جس کا تعلّق میری ازدواجی زندگی سے تھا۔ دوسرے تار یعنی غیر ازدواجی رومانوں کے تار کبھی کبھی خوش آہنگ و خوش آیند نغمے پیدا کرتے تھے، لیکن اکثر یا تو خاموش ہو جاتے تھے یا ناہم آہنگ آوازیں پیدا کرتے تھے ـــــ اس طرح غصّہ و نفرت کے طوفان میرے اندر سے رفع دفع نہ ہو سکے، لیکن میری شخصیّت کی جڑیں یہ آندھیاں اکھاڑ نہ سکیں، میری علمی دلچسپیاں بلند اخلاقی قدروں کو اپنے تخیّل میں جگہ دینے کا عمل، زندگی کے خوبصورت تصوّرات، سیاسی اور انسانی امور سے شائستہ دلچسپی، یہ تمام باتیں میری زندگی میں جاری ہیں، عملی زندگی کی نفرت، شاعرانہ زندگی میں محبّت، نیکی، نرمی اور شرافت کے پھول کھلاتی رہی۔

ریاضِ دہر میں بوئے نشاط پھیل گئی
نہالِ غم کے بھی کیا کیا گل و ثمر نکلے

ازدواجی اور عشقیہ زندگی کے مسلسل غم نے مجھے حریمِ غم کے پوشیدہ ترین مقامات سے ہم آہنگ کر دیا، میں اپنے غم کو آزمائشوں سے پرایا غم سمجھنے اور اس سے ہم آہنگ ہونے کی طرف مائل ہونے لگا۔ اور میں غم کی معنویت سمجھنے لگا۔ نطشے کا یہ فقرہ میرے لیے بہت معنی خیز ہو گیا ہے : Progress is The spireitualisation of Pain یعنی کرب کے روحانی بن جانے

کا نام بھی ترقی ہے۔ اس خیال کے تحت میں نے یہ شعر کہا ہے ؎

مٹ جائیں زمانے سے سراسر غم و اندوہ
ہوتا نہیں آیا ابھی انسان کو غمگیں،

غم عموماً شروع تو ہوتا ہے کسی ذاتی سانحہ سے لیکن اگر صحیح معنوں میں کسی کو توفیق غم ہوئی تو یہی غم حیات و کائنات کی معنویت کو سمجھنے کا ذریعہ بن جاتا ہے اور اس میں آفاقیت آجاتی ہے۔

غم نے حیات و کائنات پر جو میرا اٹل ایمان تھا، اُسے بجائے کمزور بنانے کے اور مستحکم بنایا۔ غم کا عنصر وجود کے مرکزی عناصر میں سے ہے اور نشاط کا عنصر بھی۔ ارتقائے حیات انسانی میں وہ موقعے بہت سعید و متبرک ہوتے ہیں جب ان دونوں عنصروں کا سنگم ہوتا ہے اور اُن کی وحدت کا احساس ہوتا ہے۔ عمل پذیر وجود کا یہ احساس بہت وجد آور ہوتا ہے، اور زندگی میں ایک بلند سنجیدگی اور توازن پیدا کر دیتا ہے، اب تعیّنات کے پردے اُٹھ جاتے ہیں کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا، والی منزل میں شعورِ انسانی قدم رکھتا ہے۔ ایک رباعی میں میں نے اس طرف اشارہ کیا ہے ؎

ہر ساز سے ہوتی نہیں یہ دُھن پیدا ہوتا ہے بڑے جتن سے یہ گُن پیدا
میزانِ نشاط و غم میں صدیوں تُل کر ہوتا ہے حیات میں توازن پیدا

غم و نشاط کی اصل حقیقت جب ہم پر کھلتی ہے۔ تو غم و نشاط پھر غم و نشاط

نہیں رہ جاتے، بلکہ عمل پذیر وجود کا صحیح ترین تصور بن جاتے ہیں۔ وجود کے اسی تموّج کو ہم غم و نشاط اپنی اصطلاح میں کہتے ہیں، میرزا یگانہ نے کیا شاندار رباعی کہی ہے :۔

کوئی تجھ کو پکارتا جاتا ہے　　کوئی ہمت ہارتا جاتا ہے
کوئی نَنّہ کو سدھاتا جاتا ہے　　دریا ہے کہ موج مارتا جاتا ہے

یہ خط بھی اور خطوں کی طرح خاصا طویل ہو گیا ہے۔ اپنی کچھ اور ذاتی کمزوریاں بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اب تو میں مغلوب الغضب اپنے کو اُس درجہ تک نہیں پاتا جتنا اب سے کچھ پہلے پاتا تھا۔ پھر بھی شراب کے نشتے میں اگر میرے کوئی ناخوشگوار اثر لے لیا تو حد سے تجاوز کر جاتا ہوں اور غصّے کی رَو میں بہہ جاتا ہوں۔ جوشؔ نے میرے بارے میں صحیح کہا ہے کہ ایسی حالت میں فراقؔ سے وصال ہونے سے خدا بچائے، لیکن میں اپنے محترم دوست جوشؔ صاحب کو اور دوسرے احباب کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ اب میں اس بات سے بہت چوکنّا رہتا ہوں کہ مجھے نشتے میں غصّہ نہ آئے اور اگر آئے تو حد سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ غصّے کے بعد میرا پچھتاوا ناقابلِ برداشت کرب کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور جس شخص کی دلشکنی ہوتی ہے جب تک وہ مجھ سے صاف نہ ہو جائے میں بہت دکھی رہتا ہوں۔ غصّے سے ہی متعلق میرے اندر ایک ؛ رکمزوری ہے ، وہ یہ کہ جب کوئی بحث چھڑ جاتی ہے تو کبھی کبھی میرا لہجہ حملہ آور ہو جاتا ہے لیکن

یہ کمزوری بھی اب برائے نام رہ گئی ہے، اب مجھے اس بات کا بہت دھیان رہتا ہے کہ جن لوگوں سے مجھے اُلجھنے کی نوبت آتی ہے، ہر لحاظ سے وہ مجھ سے کمزور ہیں اور برابری کے احساس کے ساتھ وہ ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے، میری عمر اور پوزیشن کا خیال کر کے انھیں دبنا پڑتا ہے۔ ایسے موقعوں کے بعد جب مجھے ہوش آتا ہے تو میں شرم سے کھُب کر رہ جاتا ہوں اور بڑی ندامت ہوتی ہے۔ چھوٹوں کی غلطی اور کمزوری کا اب میں احترام کرنے لگا ہوں اور جو لمحے بھی میرے ساتھ گزارتے ہیں انھیں اپنے خلوص و رواداری سے انتہائی طور پر خوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہوں۔ تیسری کمزوری میرے اندر یہ ہے کہ میں بہت سے کام وقت پر نہیں کر پاتا خاص کر خطوط کا جواب تو بسا اوقات دے ہی نہیں پاتا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوُا ہے کہ چند خیالات یا مسائل مجھ پر مسلط ہو گئے ہیں، اور میں گفتگو میں اپنی چہیتی نفرتوں یا Petaversion پر ہی اظہارِ خیال کرتا رہتا ہوں، لیکن اب میں سامعین کا رُخ پہچان کر گفتگو کی تمہید اُٹھاتا ہوں — معشوقوں سے اب میری محبت میں جنون کی شدت نہیں رہتی۔ جس کا خوش آئند نتیجہ یہ ہوُا ہے کہ اپنے محبوبوں سے میں اب لڑائی نہیں کیا کرتا۔ محبت میں اعتدال، محبت میں اضافہ کرتا ہے اور شدتِ محبت کے لیے عموماً مہلک ثابت ہوتی ہے۔ اشتراکیت کے فلسفہ نے میری عشقیہ زندگی کو نسبتاً بہت کچھ متوازن بنایا۔ شاید اس عمر میں تجرباتِ زندگی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ اس امر کا لحاظ رکھا جائے کہ جذبۂ عشق کہیں لے نہ اُڑے

اس اعتدال کا جو اثر میری عشقیہ شاعری پر پڑا ہے اس پر اظہارِ خیال کروں گا۔ اب کچھ اپنی شاعری پر مزید اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہوں۔ مشہور فرانسیسی نقاد سے اں بو (Saint Beaube) نے ایک مرکزی بنیادی حقیقت کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے کہ میں کسی کتاب کے دوران مطالعہ صرف ایک حقیقت کی تلاش کرتا ہوں۔ وہ یہ کہ مصنف کس حد تک ایک اچھا انسان ہے۔ یہی نظریہ (Ethical School of Criticism) یعنی اخلاقی مدرسۂ انتقاد کی روحِ رواں ہے۔ چنانچہ میری کوشش یہی رہی ہے کہ شریف ترین جذبات کو اپنی شاعری میں جگہ دوں نیکی اور پُرخلوص محبت کا تصور رشلاق مضامین ثابت ہوتا ہے۔ براہِ راست اخلاقی کلیوں کا اظہار بھی اگر وہ شاعرانہ اور کامیاب ہے تو بہت مستحسن ہے لیکن دوست یا محبوب سے باہمی تعلقات اور داخلی ارتباط کا نازک اظہار شاعر اور عاشق کی عینی شخصیت کا آئینہ ہوتا ہے۔۔۔ اُردو کے اچھے سے اچھے عشقیہ اشعار بھی بجا نوے فیصدی تک بیسیوں خوبیوں کے حامل ہوتے ہوئے شاعر کی نیک دلی معصومی، خلوص اور شرافت کی بہت کم گواہی دیتے ہیں۔ پھر یہ نیکی اور شرافت بھی کئی قسم کی ہوتی ہے اور اس کے لیے بھی کئی مدارج و مقامات ہوتے ہیں مثلاً نیاز فتحپوری نے ایک بہت باریک نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے جب وہ غالب کے بارے میں کہتے ہیں کہ غالب کے یہاں سپردگی یا استیصالِ جذبات بہت کم ہے چند اشعار کو چھوڑ کر مومن کے یہاں بھی اس کی کمی ہے۔ آتش

نوجوانی کی سرمستیوں اور بانکپن کا ملک الشعراء ہے، میرؔ کے ہم اثر و ہم آہنگ شعراء کی نیکیاں مسلّم، لیکن وہ دور رس نہیں ہے۔ میرؔ کی عظمت سے انکار کو میں انکارِ اکبر کہوں گا۔ پھر بھی سو سوا اشعار کو چھوڑ کر میرؔ کے کلام پر نظر کرنے سے کچھ ایسا احساس ہوتا ہے کہ میرؔ اردو شاعری کی تاریخ میں جتنا بڑا عاشق ہے۔ اُس سے کہیں بڑا پرستارِ عشق ہے۔ شاید اتنا بڑا پرستارِ حسن نہیں ہے —— البتہ میرؔ نے اپنی ناکامیوں سے سمجھوتہ ضرور کر لیا تھا۔

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

پھر بھی محبوب سے میرا ایک رفیقِ حیات یا جیون ساتھی کی حیثیت سے بہت کم ہم آہنگ ہے۔ میرؔ کی شرافت شروع سے اخیر تک عشق کا ایک المیہ رہتا ہے اور سانحاتِ عشق سے مقابلہ کرنے کا ایک شاندار رزمیہ، میری فطرت محبت میں عجز و انکسار اور سپردگی اور معشوق کو جیون ساتھی بنانے کا جذبہ غالب عنصر رہا ہے اور میری عشقیہ شاعری اسی جذبہ کی ترجمانی اور آئینہ داری کو اپنا مقصد مانتی رہی ہے۔ میں نے کسی فوق الانسانی شخصیت کا اظہار اپنی عشقیہ شاعری میں نہیں کیا۔ میں بڑا آدمی نہیں ہوں۔ میں معمولیت کی پرستش کرتا ہوں۔

الگ نہیں مری دنیا اگرچہ ہے معلوم　　　زمانہ اور بھلے آدمی کا ساتھ نہیں
خدا کے سامنے میرے گنہگار بھئے جو　　　انہیں سے آنکھیں برابر مری نہیں ہوتیں

جیسا ابھی پہلے وعدہ کر چکا ہوں کہ آیندہ کبھی میں یہ بتانے کی کوشش کروں گا کہ میرا تصوّرِ عشق کن کن منزلوں سے امتدادِ زمانہ کے ساتھ گزرتا رہا ہے اپنے متعلق ایک بات اور بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں بچپن ہی سے میں شدید احساسِ تنہائی کا شکار رہا ہوں۔ اس امر کی طرف کسی پہلے خط میں اشارہ بھی کر چکا ہوں۔ ایک انگریزی مصنّف کا قول ہے کہ جنسیت اس لیے انسان کو ودیعت کی گئی ہے کہ اُسے احساسِ تنہائی ہو سکے۔ میں اُس قدر جسمی لحاظ سے نہیں جتنا ذہنی لحاظ سے غالباً اس طرح کا آدمی رہا ہوں، جسے انگریزی میں oversexed کہتے ہیں۔ ذہنی لحاظ سے غالباً ہر عشقیہ شاعر oversexed یا مغلوب الجنسیت ہوتا ہے، میری شادی کی ناکامی نے غالباً میری غیر معمولی حد تک شدید جنسیت کو شدید تر بنا دیا اور اُسے بہت کچھ مستقل سا کر دیا۔ میری جنسیت میں شدت کے ساتھ ساتھ توازن پیدا ہونے نہیں پایا، لیکن اوّلاً تو میں نے اس بات کا خیال رکھا کہ عشقیہ شاعری کرنے میں بیمار تخیلات کو جگہ نہ دوں۔ دوسرے میری عشقیہ زندگی میں کچھ رومان ایسے بھی رہے ہیں جن سے کافی حد تک مجھے سکون حاصل ہوا اور ناآسودگی کا عنصر نسبتاً کم رہا، اس طرح ناکامی یا Erustration کے اثرات مہلک یا برباد کُن نہیں ہونے پائے، میرے رومان تو بیسیوں رہے ہیں۔ لیکن شدید عشق تین چار ہی اشخاص سے رہے ہیں، پہلا عشق ۱۲ دسمبر ۱۹۱۲ء میں ہوا جو چند ہفتوں کی خوشگواریوں کے بعد ہی ناقابلِ برداشت

ناکامی میں تبدیل ہوگیا اور یہ پہلا عشق مجھ پر دس بارہ برس تک مسلط رہا۔ دوسرا زبردست عشق ڈیڑھ دو برس تک رہا۔ پھر بغیر کسی اَن بن یا ناخوشگواری کے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا ہونا پڑا، تیسرا عشق کئی برس بعد ہوا۔ ۱۹۲۹ء میں جو اندازاً سال بھر اس طرح چلتا رہا کہ کبھی انتہائی خوشی اور کبھی انتہائی ناکامی' اس کے بعد تین برس کے بعد ایک زبردست عشق ہوا جس میں اندازاً سال بھر خوش رہ کر بعد کو آٹھ آٹھ آنسو رونے کی نوبت آئی۔ پھر سات برس کے وقفے کے بعد ایک زبردست عشق ہوا جو پانچ چھ ماہ تک خوش گوار رہ کر ایک مستقل عذاب میں بدل گیا ــــ "شامِ عیادت" اسی عشق کی دین ہے' اس کے بعد میرا موجودہ رومان ۱۹۵۰ء میں شروع ہوا اور یہ رومان شدید ہونے کی بجائے گہرا اور خاموش ہے اور جذبۂ محبت بہت مستقل اور متوازن ہے۔ ہوتا یہ رہا ہے کہ جب کسی معشوق سے تعلّقات، ٹوٹنے لگے ہیں یا ٹوٹ گئے ہیں تو ایک لمبے وقفے کے لیے کسی اور سے محبت کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ بچھڑے ہوئے معشوق کو "بھولنے یا بھلانے" میں برسوں لگ جاتے تھے' اپنی بدنصیبی کے باوجود میں بے وفا نہیں رہا۔ ہوں البتہ کبھی کبھی بچھڑے ہوئے معشوق کو بھلائے بغیر بھی جھک مار کر یا آزمائشاً کچھ لوگوں سے میں نے محبت کی' لیکن یہ تجربے قبل از وقت ثابت ہوتے تھے۔

ترا فراق تو اُس دم ترا فراق ہُوا
جب اُن کو پیار کیا میں نے جن سے پیار نہیں

اپنے احساسِ تنہائی کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ دو اشعار سے شاید اس احساس کا کچھ اندازہ ہو سکے :۔

کہاں کا وصل تنہائی نے شاید بھیس بدلا ہے
ترے دم بھر کے آجانے کو ہم بھی کیا سمجھتے ہیں

محبت میں مری تنہائیوں کے ہیں کئی عنواں
ترا آنا، ترا ملنا، ترا اُٹھنا، ترا جانا

کچھ اور اشعار ؎

وہ جا بھی چکا کب کا وہ بھول چکا کب کا
دل ہے کہ فراق اب تک دامن کو پکڑے ہے

عالم عالم عشق بھی تنہا تنہا حسن بھی عالم عالم

لیکن اب ایک اور بات بھی ہو گئی ہے، جو تنہائی بچپن سے کچھ برس پہلے تک میرے اندر ایک وحشت ناک حالت کر دیتی تھی۔ اب وہ میری جزوِ فطرت بن گئی ہے، اب میں اُو تنا کم ہوں، اب وحشت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ ایک سکون بھی محسوس کرتا ہوں، بلکہ زیادہ لوگوں کے ملنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک تھکا دینے والا ہنگامہ برپا ہے۔ بقول جگرؔ ؏

آ اے غمِ جدائی تجھ کو گلے لگائیں

میرے لیے ایک مستقل صورتِ حال بن چکا ہے، یوں تو میری یہ رباعی حال کی کہی ہوئی ہے :-

تنہائی میں کسے بلائیں اے دوست　　تم دور ہو کس کے پاس جائیں لے دوست
اِس دولتِ وقت سے تو دم گھٹتا ہے　　یہ نقدِ شب کہاں بھنائیں لے دوست

بلکہ اب تو مجھے لوگوں کی صحبت میں تنہائی کا احساس زیادہ ہوتا ہے۔ بقول میتھو آرنلڈ We mortal Millions Live alone تنہائی کا احساس شاید اپنے اندر یہ مقصد رکھتا ہے کہ ہم تنہائی سے مانوس وہم آہنگ ہوسکیں --- اب تنہائی سے ہم آہنگ ہوکر میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ معشوق کا آنا کسی جذباتی زلزلے کا آنا نہیں ہے، بلکہ نسیمِ سحری کا خرامِ سکوں نما ہے --- مجھے تنہائی سے ہم آہنگ ہونے میں میری شاعری سے پیدا شدہ اور دیگر گوناگوں دلچسپیوں سے پیدا شدہ افتادِ طبیعت نے کافی مدد پہنچائی ہے، پھر بھی کبھی کبھی گھبرا اٹھتا ہوں، اس لیے کہ میرا گھر کوئی گھر نہیں ہے اور گھر والوں کی قربت سے مجھے کوئی مدد نہیں ملتی۔ اپنا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر
تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی یہ رات

اگر کہیں عالمِ تنہائی میں شعر کہنے کا بھرپور موڈ پیدا ہوگیا تو تنہائی بھی

حیات آور ثابت ہوتی ہے اگرمیوں کی راتیں اکثر یا بسا اوقات یہ موڈ پیدا کر دیتی ہیں۔

یہ خط واقعی طویل ہو گیا ہے۔ آپ بھی پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہوں گے میرا ہاتھ بھی اب قلم کو آگے بڑھانے پر اڑ بیٹھا ہے۔ باقی باتیں پھر۔

آپ کا
فراقؔ

۸

۸/۴ بنک روڈ - الہ آباد

۳- ستمبر ۱۹۵۲ء

برادرم - تسلیم

آپ کے خیال کے مطابق میں عشقیہ شاعری کے پردے میں خود خطا اٹھانے لگتا ہوں - اس لیے آپ کو چڑانے کے لیے یہ خط بھی اسی موضوع پر لکھ رہا ہوں یہ طعنہ مجھے نہ دیجئے کہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے - میں جیسا کچھ ہوں - اُسی طرح آپ کے اور سب کے روبرو آنا چاہتا ہوں - البتہ اتنی درخواست آپ سے کر دوں گا - کہ میرے ان خیالات کو اپنے تک محدود رکھئے گا اور ان کا بقدرِ ضرورت خرچ ہو - معاف کرنا میں نے یہاں ایک بڑا بیہودہ فقرہ لکھ دیا ہے ' اگر میرے آئینے میں میری ہی شکل نظر آتی ہے تو اُس سے ڈرنا کیسا - میں نے کوئی پیغمبری یا اوتاری کا دعویٰ کیا ہو تو لوگوں سے خطرہ - میں تو شاعر

ہوں، بلکہ انسان ہوں، اس لیے میں شاعری بھی کروں گا۔ اور اپنے انسان ہونے کا ثبوت بھی دوں گا۔

دورِ حاضر کی اُردو شاعری میں مزاج اور لہجہ کی نرمی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں میرا کافی حصّہ رہا ہے، شاعری میں آج لہجہ اور مزاج کی اُسی نرمی پر کچھ بحث کروں گا۔ میرؔ اور اُن کے ہمعصر شعراء کے کلام کا بہت بڑا حصّہ مزاج اور نرمی کے لہجے کی مثالیں پیش کرتا ہے، ذوقؔ، مومنؔ اور غالبؔ کے یہاں یہ نرمی بہت خال خال ملتی ہے۔ مصحفیؔ کے یہاں متعدد موقعوں پر یہ نرمی مل جاتی ہے لیکن جرأتؔ، انشاءؔ، ناسخؔ و آتشؔ اور پھر اُن کے بعد داغؔ و امیرؔ کے یہاں اس نرمی کا فقدان مجھے شروع ہی سے بہت کھٹکتا تھا۔ کبھی کبھی یہ کمی جلالؔ اپنے کلام میں پوری کر دیتے ہیں اور جلالؔ کے بعد متعدد اشعار میں اس نرمی کا ثبوت جلیلؔ کا کلام دیتا ہے، دلّی کی شاعری تو داغؔ کے بعد یک گونہ ختم ہو چکی تھی۔ لیکن لکھنؤ میں محشرؔ اور عزیزؔ کے کلام میں لہجے کی نرمی کافی موقعوں پر اور جذبات کی گھلاوٹ بھی بسا اوقات مِل جاتی ہے۔ جب میری شاعری نے ہوش سنبھالا تو اُردو کے عام حلقوں پر اسی طرح کی شاعری کا اثر غالب تھا۔ جس میں نرمی کا فقدان ہو۔ بحیثیتِ مجموعی مجھے یہ احساس ہوتا رہا کہ اُردو غزل میں بہت کچھ مجھے ملتا تھا، لیکن وہ چیز بہت کم ملتی تھی، جسے ہندی میں "رس" کہتے ہیں، میں رس کے عنصر پر عاشق تھا، اس لیے شروع ہی سے لہجے کی گھلاوٹ اور نرمی کو میں نے اپنی غزل میں ایک

نمایاں جگہ دینے کی کوشش کی۔ ایک طرف تو اُردو شاعری میں شکوہ و شکایت اور جلنے بھننے کا بازار گرم تھا، عام طور پر زندگی سے بیزاری یا ایک چھچھوری خوشی یا یُوں کہیے کہ اردو غزل کی فضا میں واسوخت کا اثر چھایا ہوا تھا۔ دوسری طرف سوز و گداز کے نام سے ایک خود رحمیانہ مرثیت آچلی تھی، اُردو غزل میں جس چیز کو چکھ کر کام و دہن چٹخارہ لیتے تھے۔ وہ ایک تیز اور چرپرہ زہر تھا اور صحت مند غذا اردو میں بہت کم ملتی تھی اور جسے امرت کہتے ہیں۔ اُس کا فقدان تو مجھے مِیرؔ تک کے یہاں ملتا ہے۔ خدا پر ایمان لانا دنیا اور زندگی پر ایمان لانے سے آسان ہے، دنیا اور زندگی پر ایمان ہی سے لہجے کی وہ نرمی پیدا ہوتی ہے، جس کا میں قائل ہوں۔

لیکن یہ نرمی غیر معمولی دل و دماغ بھی چاہتی ہے۔ جب جذبات میں سوچ کا عنصر کارگر ہو، تب یہ نرمی اپنے خاموش انداز سے دل و جود کو چیر جاتی ہے، ایک مفکرانہ افتادِ مزاج اور بلند تفکر کی صلاحیت اس نرمی کے لیے درکار ہیں۔ آج میں یہ خط لکھنے میں تھکاوٹ محسوس کر رہا ہوں۔ اور آج کم فرصتی کا مجھے احساس ہے اس لیے مثالیں بہت کم دے سکوں گا۔ چند مثالیں پیش کر رہا ہوں۔

نہ گئیں سرگرانیاں تیری آہ یہ مہربانیاں تیری

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات
یاد آرہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

تیری خوشی کہ یاد رکھ تیری خوشی کہ بھول جا
تجھ سے ذرا بھی بدگماں عالمِ رفتگاں نہ تھا

آئے گنہگارانِ محبت نادم نادم نازاں نازاں

جو ترے دیار میں آرہے ارے کیسے تجھ سے جدا رہے
تجھے کچھ تو اپنا پتہ رہے یہ نہ پوچھ ہم سے کہاں کہیں

حسن کو اک حسن ہی سمجھے نہیں اور اے فراق
مہرباں نامہرباں کیا کیا سمجھ بیٹھے ہیں ہم

خطاب پھر نہ کیا تیری بے نیازی سے
تھکی تھکی سی وہ عرضِ وفا ہے یاد مجھے

ان اشعار کے علاوہ جو اشعار اس سے پہلے کے خطوں میں پیش کر چکا ہوں
اُن میں بھی بہت سے لہجہ کی اُس نرمی کی مثالیں ہیں جس کا ذکر میں کر رہا ہوں۔
میں عرض کر چکا ہوں کہ نری جنسیت یا نرا عشق صحیح معنوں میں نہ جنسیت
ہوتی ہے نہ عشق ہوتا ہے ـــــ یہی بات شاعری کے بارے میں بھی کہوں گا۔ نری

شاعری اور نرا شاعر صحیح معنوں میں نہ شاعری ہوتی ہے نہ شاعر ہوتا ہے، پوری کائنات اور تاریخ کائنات میں ایک حقیقی شاعر کو گم ہو جانا پڑتا ہے۔ میری دلچسپیاں یا میری زندگی کی محرکات حسن و عشق و شاعری کے علاوہ تمام علوم و فنون سے تھیں، تمام انسانی کلچر سے تھیں، اپنے وطن کی بدنصیبی اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کی کوششوں سے تھیں۔ آزادی کی تحریک میں ڈیڑھ برس تک قید فرنگ جھیلتا رہا۔ آئی۔سی۔ایس سے استعفا دیا اور مستقل طور پر اپنی زندگی کو اقتصادی حیثیت سے ایک معمولی زندگی بنا لیا۔ میں اپنی قربانیاں نہیں گنوا رہا ہوں، صرف اپنی دلچسپیوں پر روشنی ڈال رہا ہوں۔ انھیں غیر عشقیہ دلچسپیوں نے میری عشقیہ شاعری اور جمالیاتی شاعری کے خطوط کو توانائی اور تابانی بخشی ۱۹۳۶ء کے قریب میری ملاقات ایک بہت بڑی ہستی سے ہوئی۔ انھوں نے میرا پیچھا کر کے مجھے اپنا دوست بنا لیا اور میں اُن کے ہاتھ بے دام بک گیا۔ ایک بار ترقی پسند شاعری پر دوران گفتگو میں نے حسرت کا ذکر کیا اور کہا کہ حسرت اپنی غزلوں میں ہمیں حقیقتیں دیتے ہیں۔ انھوں نے کہا۔ لیکن بہت چھوٹی حقیقتیں۔ یہ فقرہ میرے لیے طلسم شاعری کی ایک کلید ثابت ہوا۔ حسرت کی صحیح قدر و قیمت تو میرے دل میں قائم رہی لیکن میں سوچنے لگا کہ عشقیہ شاعری میں وہ چیز آنے لگی جسے انگریزی میں Ballast کہتے ہیں یعنی وہ وزنی شے جو جہاز کی تہ میں جما دی جاتی ہے، تاکہ جہاز ڈانوا ڈول نہ ہو۔ جذبہ اور تفکر کا آپس میں سمو اٹھنا اور مل کر ایک ہو جانا

یہ صفت ان ملاقاتوں کے بعد سے میرے عشقیہ اشعار میں مستقل جگہ پانے لگی میرے مزاج میں پہلے ہی سے یہ بات تھی کہ عشق کائناتی اور آفاقی مسائل کے مس اور لمس سے ہی صحیح معنوں میں عشق بنتا ہے۔ نمایاں طور پر یہ اثرات اگر کوئی دیکھنا چاہے تو "شامِ عیادت"، "آدھی رات" اور "پرچھائیاں" کے عنوان سے میری تطبیقِ عشق آفاقیت کے ملتے ہوئے ڈانڈے پیش کرتی ہیں۔ یہ دھوکا اکثر لوگوں کو ہو جاتا ہے کہ وسیع اور گہرے مذاق والے آدمی کی جنسیت اور محدود دلچسپیوں والے آدمی کی جنسیت جہاں تک جنسیت کا سوال ہے دونوں ایک ہی یا یکساں چیزیں ہیں۔ یہ خیال بالکل غلط ہے۔ وسیع المذاق آدمی کے جنسی جذبات پر اس کی آفاقی دلچسپیوں کی چھوٹیں پڑیں گی۔ ۱۹۳۶ء کے بعد میری عشقیہ شاعری پر اشتراکی فلسفے کا کبھی براہِ راست اور کبھی بالواسطہ اثر برابر پڑتا رہا ہے گزشتہ اٹھارہ برسوں کے اندر کہے ہوئے اپنے کچھ عشقیہ اشعار پیش کرتا ہوں:-

جو تیرے گیسوئے پُرخم سے کھیل بھی نہ سکیں
اُن انگلیوں سے ستاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

اُبل پڑیں ابھی آبِ حیات کے چشمے شرار و سنگ کو ایسا نچوڑ سکتا ہوں
بہار جل کے خزاں ہو خزاں لہک کے بہار چمن میں ایسے شگوفے بھی چھوڑ سکتا ہوں

ترے خیال میں تیری جفا شریک نہیں　　　　بہت بھلا کے تجھے یاد کر سکا ہوں تجھے

مرے ہی جبر سے آزادیاں عبارت ہیں
کہ میں خدا کی مشیت سے کھیل سکتا ہوں
یہ برقِ خندۂ معصوم ہے کہ داغِ گناہ
میں آج روحِ طہارت سے کھیل سکتا ہوں
نقابِ غیب کی گرہیں ہیں چٹکیوں میں مری
مجاز کیا ہے حقیقت سے کھیل سکتا ہوں

خلدِ بریں میں آج تک گونج رہی ہے یہ صدا　　　　آؤ عذاب ہی سہیں کیا ہے دھرا نجات میں

جولانگہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں　　　　منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

تجھے دکھائے اگر کوئی آنکھ والا ہو　　　　کہ یہ زمیں بھی چمکتا ستارہ ہے کہ نہیں

دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

زے عاشق کے عشق میں اور اگر وہ شاعر بھی ہے تو اس کی عشقیہ شاعری میں ایک گھٹن پیدا ہو جانا ناگزیر ہے۔ آفاقی دلچسپیاں عشقیہ شاعری میں آفاقیت پیدا کر دیتی ہیں۔ میں یہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ تہذیب کے کارنامے ارتقائے جنسیت کے ہی کرشمے ہیں۔ علیٰ ہٰذا القیاس تہذیب کے کارناموں سے دلچسپیاں جنسیت کی ارتقا میں مدد دیتی ہیں۔ یہ اثر اندازی باہمی ہوتی ہے شاعر پہلے دُنیا بھر کو آنکھیں بھر کے دیکھ لیتا ہے، تب آنکھیں بند کر کے من کی جوت جگاتا ہے، بہت پاکیزہ معنوں میں شاعر کو دنیا دار اور کاروباری آدمی ہونا چاہیے۔ تاج محل شاہجہان کی ہی یادگار نہیں ہے بلکہ رموزِ مملکتِ خویش خسرواں دانند' کی جھلک بھی تاج محل میں نظر آتی ہے۔

مجھے واقعی اس اطلاع سے بڑا صدمہ ہؤا تھا۔ کہ ہم لاہور نہیں آپائیں گے۔ میں الہ آباد سے چل کر دلی پہنچ گیا تھا، مفت میں ایک سو روپیہ ضائع ہؤا۔ اس سلسلے میں جگن ناتھ آزاد نے جو آپ کو خط لکھا تھا۔ وہ واقعی سخت تھا۔ آپ بھی سچے تھے کہ لاہور میں تو ہنگامہ ہی ہوگیا۔ اور نوبت مارشل لاء تک پہنچی۔ آپ بھی کیا کرتے ـــــ آپ بھی کیا کرتے والی بات اس وقت اور بھی صادق آتی، جب ہم لاہور پہنچ جاتے اور کمروں میں بند رہتے نہ ہم انڈیا آ سکتے اور نہ ہم آپ کی یا اپنی مرضی کے مطابق گھوم سکتے، ایسے ماحول میں مشاعرے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ بہرحال مجھے ذہنی طور پر بڑی کوفت

ہوئی تھی مجھے آپ پر مطلق غصّہ نہ آیا۔ غصّہ آیا تو حالات پر — لیکن اتنے مہینوں کے بعد یہ بات آپ نے پھر کیوں چھیڑ دی۔

آپ کا
فراق

۹

۵/۴ بینک روڈ۔ الہ آباد
۲۱ - ستمبر ۱۹۵۲ء

برادرم ۔ تسلیم

آج میں یہ تو شروع میں طے نہیں کر سکتا۔ کہ کن اور کتنی چیزوں سے بحث کروں گا، لیکن پہلے اپنی نظموں کے متعلق کچھ گذارش کرنا چاہتا ہوں، اُردو ادیبوں میں ایسا بہت کم لوگ کر سکے کہ تنِ تنہا ادب کے کئی اصناف کو اپنا سکیں۔ میری ادبی تخلیقیں اتنے اصنافِ سخن میں آپ کو ملیں گی۔ دو تین کتابیں اُردو نثر میں جن کا موضوع ادبی تنقید ہے۔ جن میں انداز سے، کو میرے نزدیک خاص اہمیت حاصل ہے۔ غالباً تاثری تنقید (Impressionistic Criticism) کے مضامین کا اُردو میں یہ پہلا مجموعہ ہے۔ پھر میں نے چند افسانے بھی اُردو میں لکھے تھے، جو اب سے پچیس برس پہلے بلند ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئے ہیں اور مصروفیتوں کی وجہ سے یہ کام جاری نہیں رکھ سکا۔ قریب ایک ہزار صفحوں

کا تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ جو بہت سے رسالوں میں محفوظ تھا، میری غفلت سے دیمکوں کی نظر ہو گیا۔ اُن کی کوئی نقل میرے پاس نہیں ہے، علاوہ ادب کے فلسفہ اور سیاسیات کے بہت سے مضامین میرے ذہن میں ہیں۔ لیکن فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی، اب جہاں تک شاعری کا تعلق ہے بہت سے حضرات میری غزلوں کو اس شدت سے پسند فرماتے ہیں کہ میری نظمیں انھیں متوجہ نہیں کر سکتیں۔ ہزار ہا پرستارانِ ادب میری رباعیوں تک ہی اپنی پسندیدگی کو محدود رکھتے ہیں اور وہ بھی صرف عشقیہ یا جمالیاتی رباعیوں تک ایسے بہت کم لوگ ہیں جن کی نظر میرے تمام مساعی پر ہو یعنی نثر، غزل، عشقیہ اور جمالیاتی رباعیاں، طنزیہ رباعیاں، اخلاقی اور فلسفیانہ رباعیاں، منظریہ نظمیں، عشقیہ نظمیں، مفکرانہ و فلسفیانہ نظمیں، منظوم ترجمے، غیر مقفیٰ نظمیں، مارکسی اور اشتراکی نظمیں۔ آج اپنی نظموں میں اسلوبِ بیان اور تنوع کی کچھ مثالیں پیش کروں گا اختصار کے ساتھ۔

یہ کشتِ جہادِ عصر لہکی   کھیتوں کی سہانی سانس مہکی مہکی
سازِ امروز ہیں یہ سوزِ فردا   یہ آتشِ انقلاب دہکی دہکی

یہ ولولہ بہ امنگ دریا دریا   یہ شعلۂ بے رنگ صحرا صحرا
یہ جلوۂ انقلاب عالم عالم   یہ پرتوِ انقلاب دُنیا دُنیا

یہ دو رباعیاں انقلابِ چین پر کہی ہوئی پچپن رباعیوں کی مسلسل نظم سے پیش کی گئی ہیں۔ میں نے مختلف موضوعات پر مفرد اور مسلسل جو رباعیاں کہی ہیں اُن کی تعداد اب تک قریب سات سَو کے ہے اور ان رباعیوں میں مختلف اسالیبِ بیان کی مثالیں ملیں گی مثلاً

آجاتا ہے حسن میں سلونا پن اور چنچل پن، بال پن، نیلا پن اور
گھٹتے ہی سہاگ رات دیکھیں جو اسے بڑھ جاتا ہے حسن کا کنوارپن اور

صحرائیں زماں کے کھو جاتی ہیں صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراق تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

اک بوئے پریدۂ روحِ صہبائے طہور خیرہ خیرہ نگاہِ شمعِ سرِ طور
اُٹھتے ہیں شعلۂ دو عالم افگن وہ چشمکِ برقِ موجِ خونِ انگور

کیا یہ تینوں رباعیاں تین بالکل مختلف اسلوبوں میں نہیں ہیں؟ اس کے علاوہ میری نظم "روپیاں" بھی ملاحظہ کیجئے۔ جسے طوالت کے خوف سے یہاں درج نہیں کرتا۔ یہ نظم سو بندوں سے زائد کی ہے۔ اب اس سے بالکل مختلف اسلوب میں "تلاشِ حیات" کے عنوان سے میری طویل نظم کا ایک بند سُنئے:۔

یمن یمن عدن عدن   کلی کلی چمن چمن
بسوزِ عشق شعلہ زن   بسازِ حسن گل بدن
بہ مشکِ آہوئے ختن   بہ گیسوئے شکن شکن
بہ شیرینؔ بہ کوہکن   بہ داستانِ نلؔ دمنؔ
بہ نرگسِ پیالہ زن   بہ شئے صاعقہ فگن
بہ ہر نفس و ہر سخن   بہ ہائے و ہوئے ما و من
زمیں زمیں زمن زمن   سفر سفر وطن وطن
بہ دَیر ساز و بُت شکن   بہ ذوقِ شیخ و برہمن
بہ حق بہ کفرِ شعلہ زن   بہر خدا و اہرمن

حیات ڈھونڈھتے چلو

"دھرتی کی کروٹ" کے عنوان سے میری نظم تقریباً سات سَو مصرعوں کی ہے جس کے اسلوب کا نمونہ ذیل میں پیش کرتا ہوں :-

چاند اور سورج کی کرنوں سے   چادر بُن کے رکھ دیتے ہیں
اسی ہتھوڑے کی ضربوں سے   لوہا دُھن کر رکھ دیتے ہیں

اپنی کمر کے بُوتے سے ہم   پینگ بڑھاتے ہیں جیون کی
دو جھٹکوں میں ہلا کر رکھ دیں   ساتھی، چولیں اندر آسن کی

ہاتھ ہمارا ہی گھر گھر میں   لے کے چراغِ شام آیا ہے
بنیادوں سے ردّا ردّا   خون ہمارا کام آیا ہے

اس انداز و اسلوبِ بیان سے بلکہ اب تک جتنے انداز و اسلوبِ بیان پیش کر چکا ہوں، اُن سب سے مختلف اسلوبِ بیان "آدھی رات" کے عنوان سے جو میری نظم ہے، اُس سے پیش کر رہا ہوں :-

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
زمیں سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جدھر نگاہ کریں اک سکوتِ بے پایاں
جھلک رہا ہے پڑا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
اک ایک کرکے تندا سے چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہے
فلک پہ تاروں کو پہلی جمائیاں آئیں

گلوں نے چادرِ شبنم میں منہ لپیٹ لیا
لبوں پہ سو گئی کلیوں کے مسکراہٹ بھی
ذرا بھی سنبلِ تر کی لٹیں نہیں ہلتیں،
سکوتِ نیم شبی کی حدیں نہیں ملتیں
زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا   میرے خیال سے اب ایک بج رہا ہوگا

غیر مقفیٰ شاعری یعنی Blanke verse کی یہ ایک مثال ہے
جس سے ہر وہ شخص جس کا مذاق رچا ہوا ہے یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اُردو نظم کا
مزاج غیر مقفیٰ شاعری کو قبول کرنے سے قاصر نہیں ہے۔ اب اسلوب بیان کی تمام
مثالوں سے علیحدہ کچھ اور مثالیں دیکھئے "ترانۂ خزاں کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

جاں دادۂ ہستیٔ پریشان چمن تو
تنہا دم تنہائی نگہبان چمن تو
خلوت کدۂ رازہیں مہمان چمن تو
خمیازہ کشِ بادۂ عرفان چمن تو
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

تو رہزنِ سرمایہ و سامانِ گلستاں
تو رہبر سر منزلِ عرفانِ گلستاں
از سمتِ عدم سلسلہ جنبانِ گلستاں
جانِ دگر قالبِ بے جانِ گلستاں
اے بادِ خزاں بادِ خزاں بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

عشق اور موت کے عنوان سے میری نظم کا یہ بند محض اسلوب کے لحاظ سے دیکھیں :-

ایک پرانے کمرے میں
ہلکی ہلکی روشنی تھی
چھیڑا ہوا تھا سازِ طرب
تم بیٹھے تھے جہاں گویا
اک تصویر حیات کی تھی
اور حیات کے عاشق کی
موت اک نغمہ گاتی تھی

اس کے بعد رقصِ شب تاز میں اسلوبِ بیان کا یکلخت بدل جانا ملاحظہ کریں :-

رات ہنس دیتی ہے با دیدۂ پرنم ساقی
بتیاں خونِ رگِ تاک کی جب جلتی ہیں
جگمگا اٹھتی ہے تاریکیٔ عالم ساقی
جب پیالوں میں چراغوں کی لویں ڈھلتی ہیں

گشت میں اندازِ جہانِ گذراں ہے ساقی
سر کے پردوں سے کوئی دردِ نہاں اٹھتا ہے

بزم میں عُود کی موجوں کا سماں ہے ساقی
صاف سارنگی کی لہروں سے دھواں اُٹھتا ہے

اکبر الہ آبادی پر میری ایک نظم ہے جس کے کچھ بند پیش کرتا ہوں :۔

ترے کلام میں تھی گدگدی بھی آنسو بھی   کبھی وطن کو ہنسایا کبھی اُداس کیا
سخن کے ساز میں وہ درد بھر دیا تو نے   وطن کو اپنے ترانوں سے خود شناس کیا

میں سوچتا ہوں کہاں وہ سیاسی نعروں میں   جو تازیانۂ تہمت تری نتارہ میں ہے
کہاں وہ تلخ کلامی میں شیخ و واعظ کی   جو تیز نشتریت تیری چھیڑ چھاڑ میں ہے

تری شگفتہ نوائی کی وہ بہارِ سخن   کہ شعر شعر میں کھلتا ہوا گلستاں تھا
کچھ آنکھ والے ہی اس کو پرکھ سکے لیکن   پسِ مزاح جو اشکوں کا شبستاں تھا

بہت سے خطبۂ سنجیدہ ہم نے دیکھے ہیں   ہزار فکر و نظر تیرے قہقہوں پہ نثار
چمن میں منہ بندھی کلیوں نے خون تھوک دیا   جو گلستاں پہ پڑی تیرے چہچہوں کی سنوار

ہماری نیند نے مُردوں سے شرط باندھی تھی   حیاتِ ہند کے ماتھے پہ موت کا تھا کلنک
وہ تیز ٹیس اٹھی آنکھ کھل گئی جو لگا   ترے تبسم زیر لبی کا تیکھا ڈنک

اب میری ایک عوامی نظم "ڈالر ویس" کے دو بند ملاحظہ فرمائیں :-

وہ وال سٹریٹ کا ستّا خانہ، وہائٹ ہاؤس کا سازش گھر
وہ ودّالی کے داؤ پیچ وہ ڈپلومیسی کے چھو منتر
وہ لوٹا لوٹ تجارت میں وہ جنتا راج کا آڈمبر
وہ لین دین میں کھینچا تانی راج نیت کی اگر مگر
ہم ڈالر ویس کو دیکھ آئے

اس وال اسٹریٹ میں دنیا کا دیوالہ بولا جاتا ہے
جو لٹوا دے جو بکوا دے وہ کھاتا کھولا جاتا ہے
اس وھائٹ ہاؤس میں سب کی دکھتی رگوں کو ٹٹولا جاتا ہے
سرکاروں ملکوں قوموں کو کانٹوں میں تولا جاتا ہے
ہم ڈالر ویس کو دیکھ آئے

طوالت کے خوف سے اب صرف ایک اور اقتباس اپنی نظم "شاہنامۂ آدم" سے پیش کروں گا :-

قرنوں کے مٹانے سے مٹے ہیں نہ مٹیں گے
آفاتِ زمانہ سے جھکے ہیں نہ جھکیں گے
ابھرے تو دبانے سے دبے ہیں نہ دبیں گے
ہم موت کے مارے بھی مرے ہیں نہ مریں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جو شاخ لچکتی ہے کڑکتی سی کماں ہے
جو چیز چمک جاتی ہے اک نوکِ سناں ہے
اک ایک کرن تاروں کی ناگن کی زباں ہے
ہر لحظہ یہی خوف کہ اب سکے نہ بچیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

کھیتی کو سنوارا تو سنورتے گئے خود بھی
فصلوں کو اُبھارا تو اُبھرتے گئے خود بھی
فطرت کو نکھارا تو نکھرتے گئے خود بھی
نت اپنے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

یہ سب اقتباسات مشتے نمونہ از خروارے ہیں' انھیں پیش کرنے سے اپنی قصیدہ خوانی میری مراد نہیں ہے بلکہ آپ حضرات کو دعوتِ غور و فکر دینا مراد ہے۔ اُردو نظم کے مشاہیر نظیر اکبرآبادی، سودا، انیس، اکبر، چکبست، درگا سہائے سرور، اقبال، حفیظ جالندھری، حالی، اختر شیرانی کے کارناموں سے انکار کرنا کسی کے لیے ممکن نہیں، لیکن جعفریؔ کے گیتوں کو اگر ہم الگ کردیں تو ان تمام مشاہیر کی سنجیدہ مسلسل نظموں میں اسلوب کا تنوع اور اس کی رنگا رنگی نہ ملے گی۔ جوش ملیح آبادی کے یہاں دو تین اسالیبِ بیان ضرور مل جائیں گے، لیکن میں نہایت خاکساری سے عرض کروں گا

کو تعداد میں اتنے زیادہ مختلف اسالیبِ بیان جتنے اس خط میں پیش کئے گئے ہیں کہیں اور نہیں ملیں گے، یہ سب اسالیب محض میرے دماغ کی اُپج نہیں ہیں، بلکہ مختلف زبانوں کے ادب کی ٹکنیک میرے اسالیب بیان پر اثر انداز رہی ہے، غزلوں میں بھی غالباً سب سے زیادہ اسالیب بیان کے نمونے پیش کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ایک گذارش اور ہے پچھلے چالیس پچاس سال کی اُردو شاعری میں بحیثیت ہندی الفاظ روزمرہ ٹکسالی بول اور محاوروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیش کرنے میں میری کوششیں نگاہ توجہ چاہتی ہیں۔خوفِ طوالت سے ان کی مثالیں پیش نہیں کر سکتا۔استعاروں اور تشبیہوں اور تعبیروں کی بھی غالباً جوش ملیح آبادی کو چھوڑ کر میں زیادہ سے زیادہ اور نازک سے نازک نمونے پیش کر سکا ہوں۔معلوم نہیں آج کے خط میں جو باتیں میں نے عرض کی ہیں، اُن پر کتنوں کی توجہ جا سکی ہے۔ ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اپنے متعلق کوئی پُر مبالغہ خوش خیالی رکھتا ہوں یا میں بر خود غلط آدمی ہوں۔مشاہیر اُردو کی خدمات کا اتنا ہی احترام کرتا ہوں۔جتنا تمام پرستارانِ اُردو کرتے ہیں۔پھر میرے کلام کا مجموعہ جو شائع ہوا ہے وہ پُورے کلام کے نصف سے بھی کم ہے اور گذشتہ دس بارہ برس کے اندر چار پانچ ہزار اشعار کا میرا مجموعہ اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے۔ایسے بہت کم حضرات ہوں گے جنھوں نے تمام مختلف رسالوں کو دیکھا ہو جن میں گذشتہ دس بارہ برس کے اندر میرا کلام چھپتا رہا ہے اس لیے اس کی ضرورت پڑی کہ اپنی کوششوں

کی طرف کچھ اشارہ کروں، مجھے ایسا کرنے میں بڑی ہچکچاہٹ محسوس ہوتی اور ہو رہی ہے اسی لیے آپ کے ارشاد کی تعمیل کئی مہینے بعد کر رہا ہوں، مجھ میں نہ جھوٹا پندار ہے نہ جھوٹی خاکساری۔ میں اپنی شاعری کی اُتنی ہی قدر کرتا ہوں جتنی مناسب ہے اُس پر نظرِ ثانی کی ضرورت کا بھی مجھے احساس ہے۔ جیسی شاعری کر سکا ہوں، اُس سے کہیں بلند تر شاعری کے امکانات کا بھی قائل ہوں۔

سوچتا ہوں کہ کیا کیا کروں۔ یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے درس و تدریس کے کام کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں، مسلسل کئی گھنٹوں تک انگریزی کے ادبیاتِ عالیہ کے اقدار پر لکچر دینے کے بعد تھک جاتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں شاعر نہیں ہوں، بلکہ صرف معلم و نقاد ادب ہوں؟ پھر دنیا بھر کے بلند ترین فلسفہ و فکریات اور مختلف علوم پر سوچتے سمجھتے بہت سا وقت کٹ جاتا ہے، پھر بھی میری شاعری کی عمر اب اندازاً چالیس برس ہو چکی ہے اور اب اتنی مشق ہو چکی ہے کہ چند لمحوں کے وقفہ میں بھی ایسے اشعار کہہ لوں، جن میں لمبے برسوں کی مشق، مطالعہ، غور و فکر، تجربات و مشاہدات سبھی کچھ آ جائیں۔ محض طباعی سے یا ذاتی فطنت سے یا محض اپنے زورِ بازو سے کوئی شاعر اپنے کلام میں گہرائی و گیرائی، وزن و بلندی اور اعلیٰ جمالیاتی قدریں نہیں پیدا کر سکتا۔ اور مصروفیتوں کے علاوہ خرابیٔ صحت اور گھریلو جھنجھٹ، پھر اقتصادی جھنجھٹ بھی مجھے اس طرح ادبی کام نہیں کرنے دیتے جس طرح میں کرنا چاہتا ہوں۔ اب میری زندگی کی شام ہے

کہ تعداد میں اتنے زیادہ مختلف اسالیبِ بیان جتنے اس خط میں پیش کئے گئے ہیں کہیں اور نہیں ملیں گے، یہ سب اسالیب محض میرے دماغ کی اُپج نہیں ہیں، بلکہ مختلف زبانوں کے ادب کی ٹکنیک میرے اسالیبِ بیان پر اثر انداز رہی ہے، غزلوں میں بھی غالباً سب سے زیادہ اسالیب بیان کے نمونے پیش کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔ ایک گذارش اور ہے پچھلے چالیس پچاس سال کی اُردو شاعری میں ٹھیٹ ہندی الفاظ روز مرہ ٹکسالی بول اور محاوروں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیش کرنے میں میری کوششیں نگاہِ توجہ چاہتی ہیں۔ خوفِ طوالت سے ان کی مثالیں پیش نہیں کرسکتا۔ استعاروں اور تشبیہوں اور تعبیروں کی بھی غالباً جوش ملیح آبادی کو چھوڑ کر میں زیادہ سے زیادہ اور نازک سے نازک نمونے پیش کرسکا ہوں۔ معلوم نہیں آج کے خط میں جو باتیں میں نے عرض کی ہیں اُن پر کتنوں کی توجہ جاسکی ہے۔ ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں اپنے متعلق کوئی پُر مبالغہ خوش خیالی رکھتا ہوں یا میں بر خود غلط آدمی ہوں۔ مشاہیرِ اُردو کی خدمات کا انتہائی احترام کرتا ہوں۔ جتنا تمام پرستارانِ اُردو کرتے ہیں۔ پھر میرے کلام کا مجموعہ جو شائع ہوا ہے وہ پُورے کلام کے نصف سے بھی کم ہے اور گذشتہ دس بارہ برس کے اندر چار پانچ ہزار اشعار کا میرا مجموعہ اب تک کتابی شکل میں شائع نہیں ہوا ہے۔ ایسے بہت کم حضرات ہوں گے جنھوں نے تمام مختلف رسالوں کو دیکھا ہو جن میں گذشتہ دس بارہ برس کے اندر میرا کلام چھپتا رہا ہے۔ اس لیے اس کی ضرورت پڑی کہ اپنی کوششوں

کی طرف کچھ اشارہ کر دوں، مجھے ایسا کرنے میں بڑی ہچکچاہٹ محسوس ہوئی اور ہو رہی ہے اسی لیے آپ کے ارشاد کی تعمیل کئی مہینے بعد کر رہا ہوں، مجھ میں نہ جھوٹا پندار ہے نہ جھوٹی خاکساری۔ میں اپنی شاعری کی اُتنی ہی قدر کرتا ہوں جتنی مناسب ہے، اُس پر نظرِ ثانی کی ضرورت کا بھی مجھے احساس ہے۔ جیسی شاعری کر سکا ہوں، اُس سے کہیں بلند تر شاعری کے امکانات کا بھی قائل ہوں۔

سوچتا ہوں کہ کیا کیا کروں۔ یونیورسٹی میں انگریزی ادب کے درس و تدریس کے کام کو میں بہت اہمیت دیتا ہوں۔ مسلسل کئی گھنٹوں تک انگریزی کے ادبیاتِ عالیہ کے اقدار پر لکچر دینے کے بعد تھک جاتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ میں شاعر نہیں ہوں، بلکہ صرف معلم و نقاد ادب ہوں؟ پھر دنیا بھر کے بلند ترین فلسفہ و فکریات اور مختلف علوم پر سوچتے سمجھتے بہت سا وقت کٹ جاتا ہے، پھر بھی میری شاعری کی عمر اب اندازاً چالیس برس ہو چکی ہے اور اب اتنی مشق ہو چکی ہے کہ چند لمحوں کے وقفہ میں بھی ایسے اشعار کہہ لوں، جن میں اتنے برسوں کی مشق، مطالعہ، غور و فکر، تجربات و مشاہدات سبھی کچھ آ جائیں۔ محض طباعی سے یا ذاتی فتنت سے یا محض اپنے زورِ بازو سے کوئی شاعر اپنے کلام میں گہرائی و گیرائی، وزن و بلندی اور اعلیٰ جمالیاتی قدریں نہیں پیدا کر سکتا۔ اور مصروفیتوں کے علاوہ خرابیِ صحت اور گھریلو جھنجھٹ، پھر اقتصادی جھنجھٹ بھی مجھے اس طرح ادبی کام نہیں کرنے دیتے جس طرح میں کرنا چاہتا ہوں۔ اب میری زندگی کی شام ہے

دن ڈوبنے سے پہلے جو تھوڑا سا وقت بچ رہا ہے کاش میں اس مختصر وقفے میں اُن کاموں کا ایک حصہ انجام دے سکتا۔ جن کا نقشہ میرے دماغ میں ہے۔ مجھے خالص ادبی خدمت کرنے کے لیے یک سوئی کی ضرورت ہے اور وہ یکسوئی مجھے نصیب نہیں، بہر حال اپنی سی کوشش جاری ہے اور جاری رہے گی۔ زندگی کی مشکلات میں ایک مشکل یہ بھی ہے کہ کوئی جتنا اور جیسا کام کرنا چاہے اتنا اور ویسا نہ کر سکے۔

یہ خط لکھ رہا ہوں اور ایک ایسے صاحب آ پہنچے ہیں۔ جن کی صورت دیکھ کر میں ایک حرف بھی اور نہیں لکھ سکتا۔ چلو اچھا ہوا، اگر وہ نہ آتے تو نہ جانے کب تک بیٹھا اپنی جان کھپاتا رہتا، اور پھر بھی یہ جواب میں سنتا کہ فلاں بات کا تو جواب ہی نہیں دیا، میں سوال جواب کا قائل نہیں ہوں۔ یعنی افسری ماتحتی کا قائل نہیں کہ حاضر جناب کہتا رہوں' یہ فقرہ لکھ تو گیا ہوں، لیکن سوچنے لگا ہوں کہ ممکن ہے آپ شاعروں کو تھوڑی بہت رعایت دینا بھی گناہ سمجھتے ہوں۔

آپ کا

فراق

۱۰

۸/۴ بینک روڈ۔ الٰہ آباد
۴۔ اکتوبر ۱۹۵۲ء

برادرم۔ تسلیم

جی ہاں، آپ کا خیال درست ہے کہ کبھی کبھی اردو غزل کے اشعار پر یہ کہہ کر داد دی جاتی ہے کہ شاعر نے آپ بیتی کو جگ بیتی بنا دیا ہے۔ میں اس فقرے کو انتقاداتِ عالیہ کا مرتبہ دیتا ہوں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اُردو غزل کا ایک بہت بڑا حصہ ایسی آپ بیتی کی مثالیں پیش کرتا ہے، جسے ہم کسی طرح جگ بیتی نہیں کہہ سکتے، میں زندگی بھر ناقابلِ برداشت حد تک ایک دُکھی اور غمزدہ انسان رہا ہوں، تلخیوں، بیزاریوں، پریشانیوں، اپنی حالت سے نفرت، یہ وہ عناصر رہے ہیں جن سے میری ہستی عبارت تھی مگر نفرت کا شکار ہوتے ہوئے بھی یا یوں کہیے نفرت سے دانت پیستے ہوئے بھی میں نفرت پروانت

پسندا رہتا ہوں، اگر میں مغلوب المنفرت تھا تو نفرت کو بھی میں نے ہمیشہ مغلوب الفراق رکھا۔ میں اپنی نفرت سے انتقام لیتا رہتا ہوں۔ اس لیے میری شاعری میں 'میں' کا عنصر قریب قریب مفقود ہے، میری شاعری میں 'میں' نہیں ہے بلکہ 'ہم' ہے یا کائنات وحیات ہے، میں شہرۂ آفاق شاعر اور مفکر گیٹے کی کتاب Sorrows of Verther نہیں پڑھ سکا اور اس قسم کی کتابوں کی مجھے برداشت ہی نہیں۔ دوسری چیز جو میں نے اپنی زندگی میں محسوس کی وہ ماتم جوانی کی حماقت ہے۔ میری جوانی میرے لیے زہر تھی، یا زہر بنا دی گئی تھی، اگرچہ نوجوانوں میں عموماً میں ایک معصومی اور ایک ایسی دوشیزگی پاتا ہوں، جو خراب ہو کر یا خراب کیے جانے پر بھی دوشیزگی ہی رہتی ہے۔ پھر بھی جب تک کسی نوجوان میں میں بھولے پن کے ساتھ ساتھ یا شگفتگی کے ساتھ ساتھ سنجیدگی نہ پاؤں۔ مجھے آسودگی نہیں ہوتی، البتہ بہت سے نوجوانوں میں میں نے نیم افسردگی پائی ہے، یا شدتِ نشاط سے انھیں محروم پایا ہے، کسی مصیبت کی وجہ سے نہیں بلکہ جذباتی دیوالیہ پن کی وجہ سے۔ اپنی اس دریافت کو میں نے ایک شعر اور ایک رباعی میں یوں ظاہر کیا ہے:

قبل اس کے کہ ہو فیصلۂ خیر و شر
جینے کا ثبوت دے زمانے میں بشر
بے حس کردار نیک سے موت بھلی
نامرد اخلاق سے جرائم بہتر

ریاضِ دہر میں جھوٹی ہنسی بھی ہم نے دیکھی ہے
گلستاں در بغل ہر غنچہ خنداں نہیں ہوتا

یہ تھا بوڑھی اور نامرد جوانی کا ماتم۔ جذباتی بے ظرفی سب سے بدتوفیقی ہے۔ جس آدمی میں شدید طور پر نہال ہو جانے یا شدتِ نشاط سے بے اختیار ہو جانے کی صلاحیت ہوتی ہے، اُس میں شدتِ غم سے انتہائی طور پر غمزدہ ہو جانے کی بھی صلاحیت ہوتی ہے ـــــ یہ ہے ہیجان اور انتشار جو فنکار کے لیے ضروری ہے بہت سے بحرانی ادوار سے گذر کر ہی کوئی بڑا شاعر یا فنکار ہو سکتا ہے Out of Chaos is Born a dancing star کاش یہ مشکل سے سمجھ میں آنے والی حقیقت اُن سطحی سنجیدگی اور بے وزن توازن والے حضرات کے پلّے پڑ جاتی، جن کی ایک دلچسپ مثال نواب جعفر علی خاں صاحب اثر ہیں، ایسے لوگ نہ بڑے سخن گو ہو سکتے ہیں نہ بڑے سخن فہم، ان کا ادبی مذاق، روحانی ضعفِ باہ کا شکار ہوتا ہے، لیکن کچھ ہستیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ جو شاعر یا فنکار تو نہیں ہوتیں، بلکہ شاعر و فنکار سے کمتر ہیں، پھر بھی شاعر و فنکار کو اُن پر رشک آتا ہے۔ وہ اُن معصوم انسانوں کی ہستیاں ہیں جو جذباتی طور پر دیوالیہ تو نہیں ہوتے، لیکن جن میں ایک فطری اعتدال ہوتا ہے جن کے ہونٹوں پر ایک نرم مسکراہٹ ہمیشہ کھیلتی ہے، اور جو خوش نصیب اور بدنصیب دونوں حالات میں بغیر کسی کوشش کے متوازن و معتدل رہتے ہیں، یہ معصوم ہستیاں بڑے شاعر و فنکار سے فنیت، روحانیت، بلند فکر، ذہانت، پروازِ تخیل، آفاقی تصور

میں کمتر ہوتے ہیں، لیکن بلند ترین شاعر و فنکار کے دل میں ان کا احترام ہوتا ہے اور اُن کے لیے ایک رشک کا جذبہ ہوتا ہے، یہاں کمتری برتری بن جاتی ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ جسے ہم دل و دماغ کی برتری و عظمت کہتے ہیں وہ ایک طرح کا پاگل پن ہے، بہر حال میں نے ایک معلّم، ایک پڑھے لکھے ہوئے آدمی اور ایک شاعر کی حیثیت سے احترام جہل کرنا سیکھا ہے، یا احترام کمتری۔ کیا، بیوقوف، ہونا ایک طرح کی خوش توفیقی نہیں ہے شکسپیئر انھیں بیوقوفوں یعنی Clowns یا Jesters سے کبھی کبھی وہ باتیں کہلوا دیتا ہے، جن کی آنچ سے عقل کے پر جلتے ہیں، پرستش کمتری میں ہی اعلیٰ جمہوریت کے رموز پنہاں ہیں اور مساوات و اخوتِ انسانی کے بھی۔ میرے سیاسی، تہذیبی اور تمدنی عقائد کا اندازہ میرے مندرجہ بالا بیان سے آپ کرسکتے ہیں۔

ترقی پسند ادب کی تحریک جس سے میں وابستہ ہوں بہت سی غلط فہمیوں کا شکار رہی ہے۔ یہ غلط فہمیاں بڑی حد تک دور ہوسکتی ہیں۔ اگر اتنی بات لوگوں کی سمجھ میں آجائے کہ آج اس تحریک میں جو لوگ شریک ہیں وہ ہر معاملے میں ہمخیال نہیں ہیں، صرف چند بنیادی مسائل پر وہ متحد و متفق ہیں۔ وہ بنیادی مسائل یہ ہیں:-

(۱) ادب کے ذریعے سے عوام کو اس کے لیے بیدار و منظم کیا جائے کہ وہ دنیا میں تیسری جنگ نہ ہونے دیں۔

(۲) ملوکیت یا غلامی کو دنیا سے مٹایا جائے اس کے لیے عوام عالم کو

بیدار و منظم کیا جائے اور تمام ایسی کوششوں کو مدد پہنچائی جائے ۔

(۳) اپنے ملک میں حکومت کے ذریعے سے اور حکومت کی مدد سے جو نظام قائم ہے اُس سے ہونے والی بے انصافیوں بدعنوانیوں اور بدنظمیوں کے خلاف جد و جہد جاری رکھنا، یوں تو یہ سب کام سیاسی پارٹیوں کا ہے یا عوام کی غیر ادبی کوششوں کا لیکن ان کوششوں کو فنکارانہ انداز سے ادب میں پیش کرنا سیاسی پارٹیوں یا عوام کا کام نہیں ہے بلکہ ترقی پسند ادیبوں اور فنکاروں کا ہے۔ ان کوششوں کے جمالیاتی اور وجدانی پہلو فنکار ہی اجاگر کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ حسن و عشق کی داستان، حسن فطرت کا بیان، حیات و کائنات کے بیشمار پہلو ہیں جن کو صحت مندانہ اور صالح انداز سے پیش کرنا بھی ترقی پسند ادیبوں کا فرض ہے ۔

ترقی پسند شاعری کے متعلق میں کہہ تو بہت کچھ سکتا ہوں، لیکن کہوں گا صرف ایک بات اور وہ ہے حسن بیان سے متعلق، جس طرح ترقی پسند تحریک سے پہلے کے ادب میں قدرِ اوّل کی قدرِ دوئم کی قدر سوئم کی اور گھٹیا چیزیں ملتی رہی ہیں، اسی طرح ترقی پسند ادب میں بھی ہوا ہے، فنی نکات لیکن کسی فنی نکات سے ہمارے اچھے خاصے ترقی پسند شاعر اپنی ناواقفیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ لفظوں کا غلط استعمال، محاوروں سے ناواقفیت، مہمل تشبیہیں اور استعارے، صحیح مگر بے اثر اندازِ بیان، ان چیزوں کی طرف اُن ترقی پسند شعراء نے بھی کم توجہ کی جو آج اس تحریک کے لیڈر مانے جاتے ہیں یا اس تحریک میں چوٹی کا مقام رکھتے ہیں۔ غالب، میر، اقبال، ملٹن، ورڈسورتھ

کیٹس، ٹینی سن وغیرہ کا مرتبہ فنی لحاظ سے میرے نزدیک ابھی کسی ترقی پسند شاعر کو نصیب نہیں ہو سکا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہوں گا کہ کچھ لوگ اس تہذیب کے ٹھیکے دار بھی بن گئے ہیں۔ اگر کوئی شاعر کیمونسٹ پارٹی کا ممبر نہیں ہے اور نظر انداز بھی کیا نہیں جا سکتا۔ تو اس کے متعلق ایک ایسا انداز اختیار کیا جاتا ہے جو بہ یک وقت مُودبانہ بھی ہے اور سر پرستانہ بھی۔ اگر کوئی شاعر مثلاً میں خود عشقیہ غزلیں جمالیاتی شاعری اور ترقی پسندانہ شاعری یا مقصدی شاعری تینوں طرح کی چیزیں کہتا ہے تو اُسے صرف شاعرِ جمال اور امامِ تغزل کہہ کے داد دی جاتی ہے اور اسی طرح کے رویئے افسانہ نگاروں اور دوسرے ادیبوں کے ساتھ روا رکھے جاتے ہیں۔ آپس میں بھی ایسے شعرا جو صرف جدید شاعری کرتے ہیں یا کھلی ڈھلی ترقی پسند شاعری کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے وہ محبت اور ہم آہنگی نہیں رکھتے، جو مثال کے طور پر کہتا ہوں، مجھ میں جوش ملیح آبادی میں اور جگر مرآبادی میں آپ پائیں گے۔ خاموش مزاج کے ترقی پسند شاعروں کے ساتھ یا تو سرپرستی برتی جاتی ہے یا ایسا رویہ برتا جاتا ہے۔ جسے انگریزی میں Damning With Fant praise ان باتوں سے ترقی پسند تحریک بحیثیت تحریک کے اگر ٹوٹ نہیں گئی ہے تو کمزور ضرور پڑ گئی ہے۔

آخر میں یہ کہوں گا، کہ حسن بیان محض نہ بڑے بول کا نام ہے۔ نہ محض عجیب و غریب تشبیہات کا نام ہے اور نہ محض جدت کا نام ہے۔ بلکہ بلند حسن بیان میں

آواز کی ایک شائستگی ہوتی ہے، لہجے کی ایک شرافت ہوتی ہے تفکر کی نزاکتیں اور لطافتیں ہوتی ہیں اور ایک محویت آفریں کیفیّت ہوتی ہے۔ جس کی مثالیں قدرتاً پیش کر گئے ہیں۔ ادب کو اس طرح نہیں بدلا جاتا۔ جس طرح کسی نظامِ حکومت کو بدلا جاتا ہے۔ ادب اور زبان صرف طبقوی خلیجوں پر پل نہیں باندھتے۔ بلکہ زبانی خلیجوں پر بھی پُل باندھتے ہیں، ترقی پسند ادیبوں میں باہمی چشمک کے علاوہ دوست فروشی کا عمل بھی بسا اوقات اپنے جھوٹے کرشمے دکھاتا رہتا ہے۔

آپ کا

مشتاق

۱۱

۵/۴ بنک روڈ۔ الہ آباد
۲۲۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء

برادرم۔ تسلیم

آپ کو میرا خط بڑا پسند آیا۔ شکریہ! لیکن آپ میری باتوں پر سوفیصد ایمان لانے کیلئے تیار نہیں ہیں تو نہ سہی، کچھ تو "کافر" ہوئے، میری یہی جیت ہے، اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو میری طرح آپ بھی پکّے "کافر" ہوں گے۔

شاعری کے متعلق اپنے کئی نظریے بیان کر چکا ہوں اور تھوڑی بہت ہر نظریہ کی وضاحت بھی کر چکا ہوں۔ جمالیاتی شاعری اور منظریہ شاعری کے متعلق پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ منظریہ شاعری تو اُردو میں نظیرؔ، انیسؔ اور حالؔی کے یہاں کافی ملتی ہے لیکن جمالیاتی شاعری قدیم اُردو شاعری میں نہ ہونے کے برابر رہی ہے۔ لکھنؤ کے شعرا غزل میں ایک طرح کی خارجیت ضرور لے آئے۔ لیکن عموماً اُنکی خارجیت

جمالیاتی شاعری کا منہ چڑاتی ہے۔ انگریزی لفظ Dimension کا اُردو ترجمہ مجھے لغت میں نہیں ملا، بہرحال اپنا مطلب یوں ادا کروں گا، کہ عموماً اُردو منظر یا اور جمالیاتی شاعری دو رُخی Two - Dimensional رہی ہیں یعنی عرض و طول کا تو کچھ اندازہ ہو جاتا تھا لیکن حجم، دبازت یا ضخامت کا اندازہ اس وقت ممکن ہے جب شاعری Three Dimensional اور آئنسٹائن کا چوتھا Dimension Time Space Corvature تو بڑے دور کی چیز ہے، "روپ" کی رباعیوں میں میں نے حسیت کے تیسرے Dimension کو پیش کرنے کی کئی موقعوں پر کوشش کی ہے اس کے بغیر لمسیاتی احساس مکمل نہیں ہوتا یہ چیز یا تو جوش ملیح آبادی کے یہاں ملے گی یا پھر میرے یہاں غزلوں کے جمالیاتی اشعار میں بھی لمسیات کا یہ پہلو ملے گا۔ دوسری چیز جس کی کمی اُردو شاعری میں رہی ہے وہ ہے احساسِ رنگ یا Colour Sence میں نے اُردو شاعری میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے، اپنی شاعری کی ایک خصوصیت کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں اور وہ ہے رات کی فضا اور کیفیت کو اشعار سے پیدا کر دینا۔ اس سلسلے میں ایک بات کہنے سے رہ گئی تھی اور وہ ہے ستاروں یا بزمِ انجم کا ایسا بیان جو حد درجہ کیفیت سے بوجھل ہو، میرے بہت سے اشعار میں ستاروں کا ذکر اس طرح آیا ہے، جیسا رات کی تنہائی اور رات کے سکون میں ایک حساس انسان فطری طور پر محسوس کرتا ہے، مجھے یہ پھر کہنے دیجئے کہ

ان باتوں سے میری ہرگز یہ مراد نہیں کہ میں اپنی شاعری میں ۔۔۔ سی اچھی چیزیں پاتے ہوئے بھی دوسری بہت سی اچھی چیزوں کی کمی نہیں پاتا۔ مجھے یہ مغالطہ کبھی نہیں ہؤا کہ میرا کلام اُردو شاعری میں حرفِ آخر ہے، اُردو کی منظر نگاری کو میرے کلام سے بہت فروغ ہؤا لیکن کیٹس، ٹینی سن، ملٹن، کالیداس شکسپیئر کے یہاں منظر نگاری کے جو معجزے ہیں وہاں تک میں اپنے کلام کو کبھی لے جاسکا ہوں اور کبھی نہیں لے جاسکا ہوں بحیثیت مجموعی ان دوسرے شعرا کی منظر نگاری میری منظر نگاری سے بہت بلند ہے منظریہ جمالیاتی شاعری محض فوٹوگرافی نہیں ہوتی، بلکہ مصوری کے ساتھ ساتھ اُن کیفیات کو بھی پیدا کر دینا میرے نزدیک کامیاب منظر نگاری ہے، محسوسات کو فکر یا Thought کا مرتبہ دے سکنا منظریہ یا جمالیاتی شاعری کی انتہائی منزل ہے۔ حواسِ خمسہ سے تفکر کا کام لینا بلند جمالیاتی اور منظریہ شاعری ہے، یہ تفکر کسی زبان کی آغازی یا ابتدائی منظریہ شاعری میں پیدا نہیں ہوتا حواسِ خمسہ کی تہذیب صدیوں کی تربیت چاہتی ہے۔

شاعری پر یہ بحث نامکمل رہے گی اگر ایک اور نکتہ کی طرف اشارہ نہ کیا جائے اور وہ ہے بظاہر معمولی الفاظ کا ایسا استعمال کہ شعر کیفیت اور معنویت، رنگینی، لطافت، اشاریت اور تہذیب کی تمام قدروں سے بوجھل نظر آنے لگے۔ میر کے علاوہ یہ بات ایسے مشاہیر اردو کے یہاں بھی نہیں ملتی۔ جیسے غالب، آتش وانیس اقبال بڑی حیثیت ماٰنوسیت سے یہ توفیق ہوتی ہے کہ ایک معمولی لفظ یا ایک

معمولی فقرہ ادبِ عالیہ بن جائے۔ اور میرؔ کو بھی یہ توفیق سو پچاس اشعار ہی میں ہو سکی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں :۔

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں میرؔ کو تم عبث اُداس کیا

غالبؔ کو اداس کے لفظ کا معجزہ انگیز استعمال کرنے کا ایک موقع ملا ہے اگرچہ پہلا مصرع غیر معمولی محاسن کا حامل نہیں ہے ؎

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

لیکن جو جادو میرؔ کے 'اداس' میں ہے وہ غالبؔ کے 'اداس' میں نہیں ہے

اب اپنے دو شعر حاضر کرتا ہوں ؎

یہ سہانی اُداس تنہائی لیتی ہے پچھلی رات انگڑائی

زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست
سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں،

بہرحال میرا مفہوم کچھ واضح ہو گیا ہو گا اور اس سلسلے میں میں یہی گزارش کروں گا کہ معمولی الفاظ کو غیر معمولی تاثیر دے دینے کی کوشش میں نے متعدد اشعار میں کی ہے۔ مثلاً بھولنے اور یاد کرنے کا لفظ

ہماری زندگی عشق کا وہ پہلا خواب مجھے بھی بھول چکا ہے تمہیں بھی یاد نہیں

غرض کہ کاٹ دیئے زندگی کے دن اے دوست
وہ تیری یاد میں ہوں یا ترے بھلانے میں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

یا 'خیر' کا لفظ جو بول چال کا ایک معمولی لفظ ہے ؎
ہم سے کیا ہو سکا محبت میں   تم نے تو خیر بے وفائی کی

'جاگنا'، اور 'سونا'، معمولی بول چال کے الفاظ ہیں لیکن مندرجہ ذیل شعر میں کتنے پُر تاثیر بن گئے ہیں ؎
ایک شبِ غم وہ بھی تھی جس میں نیند نہ آئی روئے بھی
ایک شبِ غم یہ بھی ہے جس میں کچھ جاگے کچھ سوئے بھی

احساس و جذبات کی معصومیت جب انتہا درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ تب معمولی الفاظ معجزہ بن جاتے ہیں اور معجزہ کر دیتے ہیں۔

اب اپنے بچپن کا ایک واقعہ سناتا ہوں، میری عمر دس گیارہ برس کی تھی اور میں جوبلی ہائی اسکول کے درجہ پانچ میں پڑھتا تھا۔ سالانہ امتحان ہو چکا تھا، ہم چار پانچ لڑکے ساتھ ٹہل رہے تھے جن میں علی احمد بھی تھا جو درجے میں ہمیشہ اول آتا تھا۔ علی احمد نے کہا۔ کہ میرا اس بار بھی اول آنا یقینی ہے۔ میں تو کچھ

پرچے بگاڑ چکا تھا اس لیے پاس ہونے کی خیر منا رہا تھا۔ علی احمد کی بات سُن کر میں نے کہا تو کچھ نہیں اور کہتا بھی کیا۔ لیکن میں نے دل میں سوچا کہ دس گیارہ برس کی عمر کے معمولی ہم جماعتوں کے مقابلے میں اول آنے کو علی احمد کتنی بڑی بات سمجھ رہا ہے اور یہ بات بھول گیا ہے کہ انسانوں ہی کی قوم میں افلاطون شیکسپیئر بیتھوفن اور گوتم بُدھ پیدا ہو چکے ہیں۔ اپنے بچپن کا یہ واقعہ اس لیے میں نے آپ کو سنایا کہ شاعری میں بھی میرا یہی نظریہ رہا ہے۔ یعنی عام مشاعرے کی داد کو میں نے اپنا مقصد شاعری کبھی نہیں سمجھا، میں نے ہمیشہ اُس شاعری کو شاعری سمجھا ہے جسے سن کر پیشوایانِ تہذیب اور علم بردارانِ ادبیاتِ عالیہ وجد کریں۔ حقیقی شاعری میرے نزدیک اُس شاعری کا نام ہے جو ہمیں عظمتِ حیات و کائنات کا احساس کرائے، جو دنیا کو اتنی بڑی محسوس کرائے، جتنی بڑی معمولی شعور کے انسان کو وہ محسوس نہیں ہو سکتی، محض جذبات خواہ وہ کتنے ہی حسین ہوں بلند شاعری کے لیے کافی نہیں ہیں۔ بلکہ جب جذبات فکرِ محض کا جزو بن جائیں یا خالص فکر بن جائیں تو بڑی شاعری جنم لیتی ہے۔ کسی قوم کی تاریخ کے وہ ابواب جن میں قومی زندگی، بلند فکریات کی منزل سے گذر رہی ہے، انھیں ابواب کا قیمتی ترین حصہ پُرعظمت شاعری ہے، قومی زندگی کے ارتقا کا نغمہ حقیقی شاعری ہے۔ انفرادی زندگی کے جذبات بھی قومی زندگی کی عظمت سے ہی عظمت حاصل کرتے ہیں۔

میں نے ایک نئی غزل کہی ہے کل کی پوری رات اسکی نذر ہوئی۔ بڑھیے اور فراق کو پیار کیجیے۔

آپ کا فراق

۱۲

۴ بینک روڈ۔ الہ آباد

۳- نومبر ۱۹۵۳ء

برادرم تسلیم

میں اپنے خطوں میں اپنے آپ کو روشناس کرانا چاہتا تھا، لیکن خود کو کھو بیٹھا ہوں اور یہ سب چالاکی آپ کی ہے۔ آپ نے جس نوعیت کے سوال پوچھے ان کا لازمی نتیجہ یہی ہونا تھا۔

مذہب اور اخلاق کا شاعری سے کیا تعلق ہے، اس کی بابت آج کچھ اظہار خیال کروں گا۔ ملٹن نے کہا تھا کہ ایک شاعر کی زندگی اپنی جگہ خود ایک نظم ہوتی ہے۔ یوں تو ملٹن کی عملی زندگی میں کئی ناخوشگوار ابواب ہیں۔ لیکن ملٹن 'زندگی' کے لفظ کو بہت بلیغ معنوں میں استعمال کر رہا ہے۔ شیلے نے کہا ہے کہ کسی بڑے شاعر کی زندگی میں کچھ ایسی کمزوریاں تو مل سکتی ہیں۔ جنھیں ہم ذاتی کمزوریاں سمجھیں

لیکن زندگی کے اہم اور بڑے معاملات میں اور زندگی کے کُلیوں میں حقیقی شاعر کا نظریہ ہمیشہ بہت پاکیزہ اور بلند تریں ہوتا ہے۔ مثلاً اپنی پہلی بیوی کی زندگی ہی میں شیلے ایک دوسری عورت کو لے کر بھاگ گیا تھا۔ اُس کی پہلی بیوی نے خودکشی کر لی، لیکن باتفاق رائے شیلے کو فرشتہ خصلت انسان کہا گیا ہے۔ اُسی طرح شیکسپیئر اپنی زندگی میں اچھی طرح کھل کھیلا تھا، لیکن اخلاق کی اعلیٰ ترین قدریں اس کے یہاں ہمیں ملتی ہیں، سقراط امرد پرست تھا، گیٹے عمر بھر حسین لڑکیوں کا پیچھا کرتا رہا۔ بدھشٹر جواری تھے، ڈکنس بھی لنگوٹ کے سچے نہ تھے، نہ شیخ سعدی نہ امیر خسرو، نہ میر نہ آتش، لیکن یہ سب کے سب مجموعی حیثیت سے بلند ترین اخلاقیات کے علمبردار تھے۔

میں ایک مدت تک مذہب اور تصوف میں منہمک رہا لیکن اب سزا کے خوف اور جزا کے لالچ سے نیک اعمال کا میں قائل نہیں، کسی شخص کی جنسی زندگی اُس کی مکمل عملی زندگی کا صرف ایک جزو ہے اور اگر یہ مکمل عملی زندگی سماج کو فائدہ پہنچاتی ہے تو ایسے شخص کو اس کی جنسی زندگی کی ظاہری بدعنوانی کی بناء پر ہم قابلِ لعنت نہیں ٹھہرا سکتے۔

میرے نزدیک ہر وہ کام جس سے انسان کی حقیقی خدمت سرانجام ہوتی ہو اخلاقی ہے مثلاً جس شخص نے پہیئے کی ایجاد کی جس نے علوم دریافت کیے، جن سے ایک طرف تو زندگی میں سینکڑوں سہولتیں پیدا ہوگئیں۔ دوسری طرف

کائنات کا تصور اور اُونچا ہوگیا۔ ان سب کے کام اور ان سب کی زندگیاں بلند اخلاق کی حامل ہیں، خواہ یہ کوئی بھی ہوں اور کہیں بھی ہوں، بقول ڈاکٹر جانسن کے دنیا میں اوباشوں اور بدمعاشوں کی کمی نہیں ہے، لیکن رچے ہوئے تلذّذ سے بہرہ اندوز ہونے کی صلاحیت بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے، اگر کوئی سماج وباؤں، بیماریوں، افلاس، قحط اور اسی طرح کی دوسری علامتوں کا شکار ہے تو اس سماج کی بلند اخلاقی خدمت عابد و زاہد نہیں کرسکتے بلکہ وہ مدبرانِ عالی کرسکتے ہیں جو سماج کے نظام کو بدل دیں۔ سب سے بڑا اخلاق اُن لوگوں کا ہے جو تہذیبوں کے موجد و پیشوا ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک اُنیسویں صدی عیسوی کی دو سب سے بڑی ہستیاں ڈاروِن اور مارکس کی ہستیاں تھیں اور یوں تو متقی، پرہیزگار، روزہ نماز کے پابند، دھرم اور شرع کو عملی جامہ پہنانے والے، بےعیب زندگیاں بسر کرنے والے اُنیسویں صدی میں کروڑوں کی تعداد میں تھے۔ بلند اخلاق محض نیک نیتی کا مرہونِ منت نہیں ہوتا۔ اخلاق ایک سیاسی اور سماجی چیز ہے۔ اس کے لیے صرف اچھا دل نہیں چاہیے بلکہ بڑا دماغ چاہیے، فرض کیجیے کہ کسی نیک سے نیک شخص کا جغرافیائی احساس کمزور ہے ایسا آدمی اپنی تمام نیکیوں سمیت اس بات کا تصور ہی نہ کرے گا کہ کوریا میں امریکہ نے کیا کیا یا ناگاساکی اور ہیروشیما میں کیا کیا۔ فرانسیسی ملوکیت انڈو چائنا میں کیا کر رہی ہے، انگریزی ملوکیت ملایا اور جنوبی افریقہ میں کیا کر رہی ہے۔ ایک دوسرا شخص ہے جو اپنی بیوی کے علاوہ دوسروں سے تعلق رکھتا ہے۔ شرابی ہے،

کبھی کبھی جھوٹ بھی ہوتا ہے، لیکن ملوکیت کے مظالم کا زندہ احساس رکھتا ہے اور ہزارہا آدمیوں کو اپنی تحریر و تقریر سے جنگ اور ملوکیت کے خطرے سے آگاہ کرتا ہے تو میں کہوں گا کہ اس دوسرے آدمی کی اخلاقی زندگی پہلے آدمی کی اخلاقی زندگی سے بلند تر ہے۔ کھیتی کو لے لیجئے۔ ایک شخص اس قدیم طریقہ سے کئی کروڑ انسانوں سے کھیتی کراتا ہے جس میں محنت اور خرچ زیادہ ہوا اور پیداوار کم، دوسرا شخص کھیتی کے ایسے طریقے ایجاد کرتا ہے کہ محنت اور خرچ کم ہو اور پیداوار کئی گنا بڑھ جائے تو اس دوسرے شخص کی خدمات زیادہ پُر اخلاق مانی جائیں گی۔

چھوٹے آدمی کا اخلاق بھی چھوٹا یا معمولی ہوتا ہے۔ بڑے آدمی کا اخلاق بھی بڑا اور پُر عظمت ہوتا ہے۔ تخیّل کی بلند اخلاق میں بہت بڑی اہمیت ہے۔ ہم میں بہت سے تو ایسے ہیں کہ جن کو تعداد یا آنکڑوں کا بہت کمزور احساس ہے۔ دوارب انسانی آبادی کا زندہ اور حسّاس تصور ان کی زندگیوں کے بیشمار امکانات اور ایک ترقی پذیر انسانیت کا تصور ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ یہ حضرات چند ذہنی تصورات یا من مانے کلیوں اور نظریوں اور حلال و حرام کی ایک فہرست کو فلسفۂ اخلاق سمجھتے ہیں۔ پوری انسانی تہذیب اور اُس کے امکانات کا تصوّر اگر کمزور ہے یا ناقص ہے یا دھندلا ہے تو اخلاق بھی کمزور، ناقص اور دھندلا رہے گا۔ دوارب انسانوں کے معاملات سمجھنا تو دور رہا ہزاروں نیک اور خوش اعمال ایسے ملیں گے جو ایک گاؤں، ایک قصبۂ ایک میونسپلٹی، ایک صوبۂ

اور ایک ملک کے معاملات میں بھی کار آمد طور پر دلچسپی لینے سے قاصر ہیں! اب وہ زمانہ گذر گیا کہ ہم ہر ایک سے یہ کہیں کہ تم اپنا کارِ منصبی پورا کرو اور دھرم شاستر اور شرع کے احکام پر چلتے رہو، تہذیب اپنے آپ کو خود سنبھال لے گی اب ہمیں اخلاق کے انقلابی تصوّر کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دینا ہے۔ اب پوری اجتماعی زندگی کو ہر فرد کے دل و دماغ میں منعکس و مرتسم کر دینا ہے۔

اب میرے عقائد آپ پر آئینہ ہو گئے ہوں گے، اور شاعری ان عقائد کو رنگا رنگ انداز سے تقویت پہنچا سکتی ہے۔ یہ بات بھی ظاہر ہو گئی ہو گی۔ شاعری تنقیدِ حیات ضرور ہے، لیکن انقلابی تنقیدِ حیات اُس تنقیدِ حیات سے بہت مختلف ہے۔ جو محض اصلاحی ہے یا جو محض افراد کو تلقین کیا کرتی ہے کہ تمھیں اپنے کام سے کام، مصیبت تو یہ ہے کہ کروڑوں کو کوئی کام بھی نہیں ملتا۔ بے روزگاروں کی فوج کا اخلاق ہو ہی کیا سکتا ہے؟ یا ایسے بارو زگاروں کا اخلاق بھی کیا ہو سکتا ہے جو اپنی اجرت سے صحت مند غذا اور دوسرے لوازماتِ زندگی نہ خرید سکیں۔ نہ اولاد کو مناسب تعلیم دلا سکیں اور نہ اولاد کو کسی قابل بنا سکیں۔ میں اخلاقیات کو 'یُگ دھرم' کہتا ہوں، آج کا 'یُگ دھرم' تمام پرانے ادوار کے 'یُگ دھرم' سے مختلف ہو چکا ہے۔

آخر میں یہ گذارش ضرور کروں گا کہ ہماری انفرادی زندگی کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ مثلاً اوروں پر اپنی شخصیت کا خوشگوار اثر ڈالنا، جہاں تک

ممکن ہو اپنے متعلقین کی و مجوئی اور اسی طرح کی دوسری بہت سی خوبیاں جو دوسروں پر اچھا اثر ڈالیں اور ہمیں بھی خوشگوار اور مطمئن رکھیں۔

"انداز" سے کا پورا مسودہ آپ کو انہی دو ایک ماہ میں بھیجدوں گا۔ میں اس پر خوب جم کر محنت کرنا چاہتا ہوں، کئی نئے مضامین ہیں۔ اُن پر از سرِ نو نظر ڈالنا ہوگی۔ یہ کام وقت لے گا۔ جتنا یہ کام آپ آسان سمجھتے ہیں، حقیقتاً اتنا ہی مشکل ہے۔ میرے لیے تو شعر کہنا بھی مصیبت ہے اور مضمون لکھنا بھی۔ وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جن کے مضامین اور شعر دوسروں کے لیے مصیبت بنے ہوئے ہیں۔

آپ کا

فراق

۱۳

۸/۴ بینک روڈ۔ الہ آباد
۱۲ر جون ۱۹۵۴ء

برادرم۔ تسلیم

آپ نے یہ خط بڑے دنوں کے بعد لکھا اور عذر یہ کیا کہ بڑا مصروف رہا۔ مصروف کون نہیں ہوتا، مصروف تو وہ بھی ہوتا ہے۔ جسے دنیا کا کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں نے جو آپ کے خطوں کے جواب میں اتنے اتنے لمبے خط لکھے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں بالکل ہی بیکار تھا۔

پہلے تو آپ کا خیال یہ تھا کہ میرے جوابات کی روشنی میں مجھ پر لکھیں گے اب آپ کا یہ کہنا کہ اگر اجازت ہو تو ان خطوط کو ہو بہو چھاپ دوں، میری طرف سے تو ان کی اشاعت کی اجازت ہے' اس دریافت کا بھی شکریہ کہ ان خطوں میں تاریخی مواد ہے اور انھیں حرف بہ حرف چھپنا چاہیئے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ

دو ایک بار آپ نے لکھا تھا کہ میں نے بعض جگہوں پر بڑی رواداری میں لکھا ہے
بس ان باتوں کا خیال رکھ لیجیے۔ لیکن یہ مت کیجئے گا۔ کہ آپ مجھے انسان بھی نہ بننے
دیں۔ میری کمزوریوں کا بھی اظہار ہونا ہی چاہیے۔ اگر مجھے پہلے علم ہوتا کہ آپ
میرے ہی خط چھاپیں گے، تو میں صرف اپنی کمزوریاں ہی کمزوریاں بیان کرتا۔ اس لیے
کہ لوگ صرف اپنی خوبیاں ہی خوبیاں بیان کرتے ہیں، اگر آپ انڈیا آرہے ہیں
تو اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہوگی، لیکن الہ آباد کا نام انڈیا نہیں ہے، اور یہ
آپ نے لکھا نہیں کہ الہ آباد بھی آؤں گا۔ مجھے اپنے پروگرام سے مطلع کیجیے گا۔

آپ کا
فراق

(۱۴)

۶۳ بینک روڈ۔ الہ آباد

۱۵ دسمبر ۱۹۵۵ء

برادرم طفیل صاحب!

آپ کے یہاں سے جانے کے بعد صرف دو مختصر سے خط ملے تھے جن کا میں نے بھی دو لفظی جواب بھیج دیا تھا تفصیلی بات چیت کے لیے تفصیلی خط لکھا کریں۔ لیجئے میں اس کی ابتدا کرتا ہوں۔

ادب سے متعلق بہت سے خیالات وسوالات اس وقت سے میرے ذہن میں اُٹھتے رہے ہیں جب سے میں نے ہوش سنبھالا۔ اس باب میں میری تین حیثیتیں ہیں۔ طالب علم ادب، عملی ادیب اور معلم ادب۔ میرے ذہن میں جہاں ادب سے متعلق اور بہت سے سوال اُٹھتے ہیں۔ ایک یہ سوال بھی بار بار اُٹھتا ہے کہ انگریزی شاعری اور انگریزی نثر کے سینکڑوں محاسن ہمارے اردو ادب میں کیوں نہیں آسکے۔

اور قریب قریب ہر لحاظ سے ہمارا اردو ادب انگریزی ادب سے کیوں کمتر ہے ؟
اس کی ایک نہیں پچاسوں وجہیں گنائی جا سکتی ہیں۔ صرف شاعری کو لے لیں۔ اقبال، جوش اور فیض تک کے یہاں وہ کئی محاسن نہیں ملتے جو منجملہ دیگر اکابر سخن کے شلاً ملٹن، سون برن، شیلے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ دوئم و سوئم صف کے انگریزی شعراء کے کلام میں جلوہ گر ہیں جیسے لنگسٹے، والٹر سکاٹ، ڈرائیڈن، فرانسس ٹامن میتھیو آرنلڈ یا پالگریو کے خزانۂ زرّیں (Golden Treasury) کے درجنوں وہ شعراء جو صفِ اوّل کے شاعر نہیں لیکن جن کی نظموں کو کئی لحاظ سے ہماری نظمیں نہیں چھو سکتی ہیں خاص کر صوتی لحاظ سے۔

گذشتہ نصف صدی سے ہمارے کئی شاعر انگریزی ادب کا مطالعہ کرتے رہے ہیں اور اس سے متاثر و فیض یاب بھی ہوتے رہے ہیں۔ پھر یہ کمی ہماری شاعری میں کیوں رہ جاتی ہے ؟ شاید ایک وجہ تو یہ رہی ہے کہ مقفیٰ شاعری میں ہم میکانکی طور پر قدیم اصنافِ سخن کی پابندی کرتے چلے آئے ہیں۔ انگریزی کے اشکالِ سٹینزا (Stanza Forms) قافیوں کی نئی خوش آئند ترتیبوں Rhymes chemes کو ہم بہت کم اپنا سکے ہیں۔ تخلیقِ فقرہ، تخلیقِ اضافت Phrasing اور Epithet میں بھی یا بیان میں نئی تعبیروں کے معاملہ میں، ایسے اسالیب کی تخلیق کے معاملہ میں جن میں ہماری زبان یا بولی کے نئے تابناک اور اعلیٰ امکانات جلوہ گر ہوں۔ ہم یورپ کے شاعروں سے بہت پیچھے

رہ گئے ہیں۔ ہماری شاعری کی زبان میں کچھ دائمی اور ناقابل ترمیم وتبدیل عناصر (Constants) پیدا ہوگئے ہیں۔ بیان کے روایتی ورسمی ٹکڑے بار بار ہماری شاعری میں آجایا کرتے ہیں ہمارے اسلوب شاعری کے کچھ معمولات بن گئے ہیں۔ دوسری وجہ اس کمی کی یہ ہے کہ خصوصاً غیر مقفیٰ شاعری میں ہم انگریزی بلینک ورس کے اکابر کی ان تکنیکوں پر عبور حاصل نہیں کرسکے، جن سے لمبے یا طولانی جملے اس طرح اُگتے ہیں جیسے کوئی سڈول متناسب جسم نشوونما حاصل کرتا ہے۔ پورے کس بل اور تناؤ کے ساتھ ایسے جملے جو کسی قدر طویل بحر میں مسلسل متعدد مصرعوں کے ذریعہ تکمیل پاسکیں۔ ابھی ہماری غیر مقفیٰ شاعری میں بہت کم آسکے ہیں۔ جاندار بلینک ورس محض عدم قافیہ سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کا داخلی عمل اُس پُرانا یام Breath Control کی صفت رکھنے والی محویت سے پیدا ہوتا ہے جس میں شاعر کا خیال مصرعوں کے زیر وبم میں منڈلاتا ہوا دکھائی اور سنائی دے۔ ابھی ہماری بلینک ورس کو جملوں کے مختلف پیمانے ڈھالنا اور سمندری جوار بھاٹوں کی شان پیدا کرنا لمبے جملوں کا فن تخلیق The Art of Long Sentence سیکھنا ہے، ایک نیا علم بیان حاصل کرنا ہے۔ فقروں کے زنجیرے باندھنا سیکھنا ہے۔ شاندار پارہ ہائے نظم Versparas کا فن ابھی ہمیں بہت کم آسکا ہے، تیسری وجہ مذکورہ بالا دوسری وجہ سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ ہماری مقفیٰ اور غیر مقفیٰ دونوں طرح کی نظمیں اکثر محض غزل کی تلبیس ہوتی ہیں۔ ان میں خیال کا تدریجی اُگاؤ یا ترقی

یا مکمل کائنات خیال بہت کم ہوتا Development of Idea ہے۔ وہ کاوے کاٹتی ہیں آگے نہیں بڑھاتیں ہم حلقوں یا دائروں میں لکھتے ہیں (Arguing in acicle) یا (Writng in circle) مختلف تشبیہوں سے ہم ایک ہی خیال کو ظاہر کرتے ہیں، مختلف خیالوں سے ایک بڑے خیال کی بڑی اکائی ہم تیار نہیں کر پاتے جسے تعمیری صلاحیت یا Architectonics کہا گیا ہے۔

یہ تمام صلاحیتیں حاصل کرنے کی طرف ہمارے شعرا کو توجہ کرنا چاہیے، ہمیں انگریزی شاعری کے غائر مطالعہ سے رہنمائی حاصل کرنا ہے۔ بلینک ورس یا نئی مقفیٰ نظمیں ہم کہنے تو لگے ہیں لیکن وہ بلند سنجیدگی The Higher Seriousness ہماری نئی تخلیقوں میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ جس کے بغیر ہماری شاعری بلند مغربی شاعری کی ہم پلہ و ہم مرتبہ نہیں ہو سکتی۔ بس آج اتنا ہی۔

اندازے پر نظر ثانی کر کے آپ کے پاس جلد ہی بھیجوں گا۔ زیادہ تاکید نہ کریں۔ ورنہ مجھے نادم ہونا پڑے گا۔ جوش کے پاکستان چلے جانے پر تو ہندوستان و پاکستان کے اخبارات بڑی گلفشانیاں کر رہے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ میاں جہاں رہو خوش رہو۔

آگے پیچھے بیخود دہلوی، ہوش بلگرامی اور مجاز کے اُٹھ جانے سے ایک خلا محسوس کر رہا ہوں۔ ابھی چراغ حسن حسرت اور منٹو کے داغ

تازہ تھے۔ اب تو جینے سے میرا جی بھر گیا ہے۔

اے موت کی نیند ہم بھی جاگے ہیں بہت
اپنا بھی تو آفتاب آئے لبِ بام

آپ کا
فراقؔ گورکھپوری

۱۵

۸/۴ بینک روڈ-الہ آباد
۲۲- دسمبر ۱۹۵۵ء

برادرم

آپ کا جواب تو نہیں آیا- پھر بھی خط لکھنے کے لیے قلم اٹھا ہی لیا ہے- آج کے خط میں کیا لکھوں- طبیعت میں سکون بھی ہے تازگی بھی اور کچھ اداسی بھی ـــ کچھ دیر سے بیٹھا ہوا اپنا یہ شعر گنگنا رہا تھا ؎

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

پچھلے دو مہینوں میں میرے یہاں کچھ غزلوں کی بارش سی ہوتی رہی ہے- میں نے تو کوئی نئی نظم کہنے کے لیے اپنے تحت الشعور کو خاموش چھوڑ دیا تھا- نہ جانے کیونکر غزلوں کی جھڑی لگ گئی- اجازت دیجئے کہ کچھ غزلوں سے چند

منتخب اشعار عرض کروں :-

دیکھتے دیکھتے دن ڈوب گیا رات ہوئی ترے قدموں کی صدا آئی کرامات ہوئی
میں یہ کہتا ہوں بچھاؤ کوئی بازی اب اور بازیٔ عشق تو سب کھیل چکے مات ہوئی
یہ ستاروں کی شعاعیں یہ ہوائیں اے دل اب ترے درد کو نیند آنے لگی رات ہوئی

اب نشاطِ حیات دور نہ پاس وصل کی رات اور اتنی اُداس
یہ دھڑکتا ہوا دلِ فطرت یہ فضا کا تموّجِ انفاس
ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو زندگی ہے کہ رام کا بن باس

مجھ کو تیرا پتہ نہیں ملتا ڈھونڈنے سے خدا نہیں ملتا
ایک مدت سے عشق ہے بے صبر کوئی صبر آزما نہیں ملتا
ساغرِ زہر ہو کہ جامِ حیات اس کے ہاتھوں سے کیا نہیں ملتا

بندگی سے کبھی نہیں ملتی اس طرح تو زندگی نہیں ملتی
آہ وہ مشک بیز زلف سیاہ؟ جس کی ہمسائگی نہیں ملتی
یوں تو ملنے کو مل گیا ہے خدا پر تری دوستی نہیں ملتی
ایک دُنیا ہے میری نظروں میں پر وہ دنیا ابھی نہیں ملتی

اک سوا آپ کے اس دل میں گزر کس کا تھا
آپ آئے ہی نہیں ورنہ یہ گھر کس کا تھا
تم سے پہچانے نہ جاتے تھے خود اپنے جلوے
تم کو معلوم ہے وہ ذوقِ نظر کس کا تھا
خود گیا اور جلو میں چمنستان گئے
برگ ہر لالہ و گل رختِ سفر کس کا تھا

کہہ گئی لہلہا کے قوسِ قزح　　داستاں تیری نوجوانی کی
آنکھ میں موجِ بادۂ شیراز　　شان ابرو میں ترکمانی کی
کھینچ دی اس کی خامشی نے فراقؔ　　ایک تصویر خوش بیانی کی

سر بسر ہے وہ سمٹے ہوئے رنگینیِ حسن
نگہِ شوق کے دامن میں تری کیسی ہے
اور لوگوں کے خطوں کے تو جواب آتے ہیں
نامہ بر آہ تری نامہ بری کیسی ہے
کس کے آنسو شبِ غم جذب ہوئے اس میں فراقؔ
آج یہ خنکیِ بادِ سحری کیسی ہے

آدمی آدمی کو بھول گیا   زندگی زندگی کو بھول گئی
"اتفاقات ہیں زمانے کے"   دوستی دوستی کو بھول گئی

اُٹھ گئی دوست کی نگاہِ کرم   شرم سے عشق پانی پانی ہے
اک قیامت ہے چھیڑنا اس کو   اے دنیا بڑی دوانی ہے
ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں فراقؔ   زندگی، ہجر کی کہانی ہے

ایک مستِ شباب کی باتیں   جیسے موجِ شراب کی باتیں
عرش والے ادب سے سنتے ہیں   عشقِ عالیجناب کی باتیں
خم بہ خم زلف سے سُنے کوئی   عشق کے پیچ و تاب کی باتیں
کہہ رہے ہیں نجوم رات گئے   اک پریشان خواب کی باتیں
آپ بھی خواب دیکھتے ہیں فراقؔ   "وقتِ پیری شباب کی باتیں"

جب مجھے تری یاد آتی ہے   آس بندھ بندھ کے ٹوٹ جاتی ہے
تیری رودادِ حسن میری غزل   داستاں داستاں سناتی ہے
معجزہ انقلاب کا دیکھو   موت بھی زندگی لٹاتی ہے
دیکھ رنگیں نوائیوں سے مری   شفقِ صبح لہلہاتی ہے

جب خطا عشق کی ہوئی مجھ سے　　زندگی ٹوٹ کر ملی مجھ سے
تجھ کو پا کر خوشی سے مر نہ گیا　　بس یہی تو ہوئی کمی مجھ سے
نگہِ نازِ یار کچھ اے دوست　　کہہ رہی تھی ابھی ابھی مجھ سے
عشق پر درگزر کرو نہ کرو　　اب تو اک بات ہو گئی مجھ سے
نگہِ شرمگیں پر اپنی نہ جا　　بے تکلف نہیں ابھی مجھ سے

ایک برقِ بلا کو دیکھا ہے　　حسنِ تاب آزما کو دیکھا ہے
کیا تعلق تری اداؤں سے　　موجِ بادِ صبا کو دیکھا ہے
حسن اس کا ہے میری نظروں میں　　مجھ سے پوچھو خدا کو دیکھا ہے
کوئی نکلا ہو جیسے چھپ کے فراق　　دل میں اک نقشِ پا کو دیکھا ہے

جل جل کر آکاش دیپ بجھ گئے فراق
پو پھٹتی ہے جیسے برہن کی چھاتی

ایک شبِ غم وہ بھی تھی جس میں نیند نہ آئے تو اشک بہائیں
ایک شبِ غم یہ بھی ہے جس میں اسے دل رو رو کے سو جائیں

حسن ہے ایک دُرِ ناسفتہ یا اک بے سونگھا ہوا پھول
ہوش فرشتوں کے بھی اُڑا دیں یہ تیری دوشیزہ ادائیں

اہلِ مسافت ایک رات کا یہ بھی ساتھ غنیمت ہے
کوچ کرو تو صدائے دینا ہم نہ کہیں سوتے رہ جائیں

مجھ کو گناہ و ثواب سے مطلب؟ لیکن عشق میں اکثر آئے
وہ لمحے خود میری ہستی جیسے مجھے دیتی ہو دعائیں

ایک غزالِ رم خوردہ کا منہ پھیرے ایسے میں گزرنا
جب ہلکی ہوئی ٹھنڈی ہوائیں دن ڈوبے آنکھیں جھپکائیں

جسمِ نازنیں میں سنّاٹا یا زمزموں بل کھائی ہوئی سی
بزمِ نازیں تیرے آتے ہی جیسے کئی شمعیں جل جائیں

اپنے دل سے غافل رہنا اہلِ عشق کا کام نہیں
حسن بھی جس کی پرچھائیں ہے آج اس من کی جوت جگائیں

باتیں اُس کی یاد آتی ہیں لیکن مجھ پر یہ نہیں کھلتا
کن باتوں پر اشک بہائیں کن باتوں سے جی بہلائیں

ہر اک کام مکمل ہو کے کوئی کمی رہ جاتی ہے
ہے بھرپور زندگی لیکن تجھ کو کہاں سے ہم پہنچائیں

دھوکے نہ کھانا اہلِ محبت سب سے بڑا یہی دھوکا ہے

پریت جگت کی ریت یہی ہے سب کھیں اور دھوکے کھائیں

رات چلی ہے جوگن ہو کر بال سنوارے لٹ چھٹکائے

چھپے فراقؔ گگن پر تارے دیپ بجھے ہم بھی سو جائیں

اب تو آپ اُدب گئے ہوں گے اس لیے شعر خوانی ختم۔ میری کتاب اردو غزل گوئی جسے آپ نے حال ہی میں شائع کیا ہے اس میں بہت شد و مد سے میں نے اُردو شاعری میں اہم ترین جگہ غزل کو دی ہے۔ لیکن آج ایسا کہتے میں ذرا ہچکچاؤں گا۔ اس خط میں یوں تو میں آپ کو غزلیں سنا تا رہا ہوں لیکن نیم شعوری طور پر یہ سوچتا رہا ہوں کہ کاش میں میتھو آرنلڈ کی نظم سہراب اور رستم یا Memorial Verses یا ٹینی کی نظم Mortede Arthur یا کیٹس کی نظم ode to Autumn اور Labelledams Sansmercy یا اوشانسی کی نظم We Are The Music Makers یا براؤننگ کی نظم Epilogue to oslando اور The Last Ride together یا کپلنگ کی نظم IF اور Lest We Forget اور انگریزی شاعروں کی صدہا نظمیں جو میرے ذہن میں گونج رہی ہیں اس طرح یا اس شان کی سترّ اسّی نظمیں بھی اُردو کو دے سکتا۔

لیکن ہائے ہائے حالت یہ ہے کہ ہم اس قسم کی منظوم اور کمی خوبیوں کی حامل صحافت کرکے مثلاً "ہم آج یلغار کر رہے ہیں"۔ یا اس قسم کے چند منظوم دلچسپ چٹکلے پیش کرکے "چاولوں کے چہرے پر مفلسی برستی ہے" کہہ کر اور مطمئن ہو کر بیٹھ رہتے ہیں۔ میری چند نظمیں بھی منظوم صحافت سے آگے نہیں بڑھ سکیں لیکن میں انھیں عمداً فنی تخلیقیں نہیں سمجھتا۔ حیران و دلچسپ ذہنی Adolescents کو چھوڑئیے۔ کالیداس کی شکنتلا یا تلسی داس کی رامائن یا حافظ کی غزلوں یا مولانا رومؒ کی مثنوی جس عظمت کا ثبوت دیتی ہے۔ اس ادبی عظمت کا ثبوت، مایکاوسکی یا نرودا پبلو۔ اگرچہ ان کے کارنامے بھی بہت پُرعظمت ہیں نہیں دے سکے لیکن میں اسے ناممکن نہیں سمجھتا کہ کمیونسٹ ادیب آئندہ ایسی عظمت کا ثبوت دے سکیں گے۔ میں خود ان کمیونسٹ ادیبوں کی خاکِ پا ہوں۔ بلکہ اس سے بھی کم جن کے نام میں نے ابھی ابھی گنوائے ہیں مگر اسے کیا کروں کہ انھیں ان ادیبوں سے ذرا سا کم پاتا ہوں جو کمیونسٹ نہیں تھے اور جن میں سے کچھ کے نام پہلے گنا چکا ہوں۔

میری ان باتوں سے کمیونسٹ تحریک اور مارکسی ادب کی تحریک کو بجائے نقصان پہنچنے کے فائدہ پہنچے گا۔ آج کا کوئی نمک حلال ادیب مارکس کی تعلیم و پیغام کو نظرانداز نہیں کرسکتا لیکن جہاں اس تعلیم و پیغام سے اس کے وجدان کو بہت سی روشنیاں اور محرکات ملیں گے لہجے کی عظمت و شرافت، طہارتِ قلب تخیل کی الوہیت نما صفتیں اور سرمدی کیفیتیں دُنیا کی کئی ہزار برس پُرانی زندہ جاوید

آفاقی ادبی مثالوں اور روایتوں سے سیکھنا پڑے گا۔ ہم تلسی داس، کالیداس، ڈانٹے ورجل اور دوسرے صدہا اکابر ادب کے کچھ مخصوص عقیدوں کو غلط سمجھنے کے باوجود ان کے رچے ہوئے مزاج، تالیف و تہذیبِ قلب، اور ان کی انسانیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کیا اس سے بے نیاز رہ کر صرف زورِ طبع و زورِ کمیونزم و مارکسزم کے بوتے پر بڑا ادب نہیں پیدا کر سکتے۔ کمیونسٹ روس اور کمیونسٹ چین میں شیکسپیر کے ڈرامے اس لیے کثرت سے نہیں کھیلے جاتے کہ اب سے کئی سو برس پہلے کے عقائد سے عوام کو روشناس کرایا جائے بلکہ اس لیے کھیلے جاتے ہیں کہ ان میں انسانیت کی وہ جگمگاتی ہوئی قدریں ہیں جو فیوڈل ازم، مرکنٹائل ازم، کیپٹل ازم اور کمیونزم یا تہذیب کے ہر جگ میں یکساں مقبول، و محبوب، و محترم رہیں گی۔ تنگ نظری، Self Sufficiency اور Exclusiveness ادب، تہذیب، انقلاب، کمیونزم سب کے لیے مہلک ہے۔ البتہ برائے نام عقیدت مندی جھک مار نیازمندی یا اکابر سلف کے کاندھوں پر سوار ہو کر اپنے چھوٹے قد کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش بھی یا بڑوں کو معکوس قبولیت سے نوازنے کی کوشش کسی ادیب کے لیے بھی خطرناک خامکاری ہے۔

ادیب کی شخصیت میں عشق حیات و کائنات کا کارفرما رہنا کامیابی کی شرط ہے اور یہ عشق محض ورسِ عمل نہیں دیتا اس میں ایک خلاقانہ اضطراب ایک من کو موہ لینے والی مجہولیت یا Wise Passiveness بھی ہوتی ہے

اِس عشق میں عملی مقاصد کے علاوہ ہمہ گیر عملی قدروں کے علاوہ ایک ماورائی وجدانی کیفیت بھی ہوتی ہے۔ ہند و دیومالا میں خالق کائنات برہما کا وہ مرتبہ نہیں ہے جو عاشق کائنات وشنو کا مرتبہ ہے۔

ہمارے شہر الہ آباد میں ہندی کی ایک شاعرہ کوکل جی ہیں۔ جن کی یہ نظم بہت مشہور ہے۔

آج رات سنگار کروں گی
کھلے پھول ساجو بن لے کر
کانٹوں کے بَن پار کروں گی

انھوں نے مجھے اپنی ایک لاجواب نظم سنائی جس میں سیکڑوں مصرعے تھے اور جس کا عنوان تھا "ماں" (یعنی بیاہی جانے والی بیٹی کا رخصت ہوتے ہوئے ماں سے خطاب) نظم سُن کر میں جھوم گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ان سے کہا کوکل جی اس امر میں آپ بھی میری ہم خیال ہوں گی کہ شاعر کو اپنے کلام کے ذریعہ سماج کی سیوا اور انسانوں کے دکھوں کو دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ کوکل جی نے کہا آپ سچ کہتے ہیں لیکن اگر ہم صرف سیاسی، سماجی، عملی، اخلاقی مسائل کے ہو رہے تو ہم اخلاقی طور پر گر جائیں گے۔ مناظر قدرت اور انسانی زندگی کا وہ پہلو جس میں خدمت سے قطع نظر محبت اور پیار کی دعوت ہمیں ملتی ہے۔ اگر ہم اس سے بے نیاز ہو گئے تو پھر ہمارے پاس رہ کیا گیا۔ ادب کو صرف درس عمل ہو کر

نہیں رہ جانا چاہیئے اگرچہ درسِ عمل بھی ادب کو ہونا چاہیئے۔

میں نے کہا۔ کوکل جی آپ نے بالکل میرے عقیدے کو دہرایا ہے اِس گفتگو کا ذکر کرتے ہوئے ہیولاک ایلس کا یہ قول مجھے یاد آتا ہے۔ جسے انھوں نے اپنی کتاب رقصِ زندگی میں درج کیا ہے،' فن اخلاق سے زیادہ اخلاقی ہوتا ہے'۔

Art is More Moreal Than Morality

یہ خط بہت طویل ہو گیا۔ بلکہ دو غزلہ کی رعایت سے دو خطا، اچھا اب رخصت۔ لیکن وہ روپوں والی بات تو پھر بھولے جا رہا ہوں۔ بات بھولی بھی تو کون سی!

آپ کا
فراق

۱۶

۸/۴ بینک روڈ۔ الہ آباد

۲۷ دسمبر ۱۹۵۵ء

برادرم!

ایک بار نقوش ہی کے صفحات میں ہم لوگوں نے اسلامی ادب کی بحث چھیڑ دی تھی کہ یہ شرارت صرف آپ کی تھی اُس سے کچھ لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ میں اسلامی عناصر کو ادب میں جگہ دینے کے خلاف ہوں۔ آیئے آج پھر اسلامی ادب کے فقرے کو سمجھنے کا جتن کریں۔ کیا اُسے یوں سمجھا جائے کہ ساڑی، سرمہ، مہتی، حج، جشنِ عید، کباب و کوفتے، ترکی ٹوپی کا ذکر ادب میں آئے تو وہ اسلامی ادب ہوگا؟ جہاں تک ترکی ٹوپی کا تعلق ہے وہ کبھی لندن میں بھی پہنی جاتی تھی ترکستان میں اور تقلیداً پان اسلام ازم کے طفیل میں ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقے میں۔ پیغمبر و اکابرِ اسلام سے اس ٹوپی کا کوئی تعلق نہیں البتہ اس سے کون انکار

کرسکتا ہے کہ سرسید کی زینت فرق تر کی ٹوپی تھی لیکن سرسید کے چیلے حالی نے حدادب سمجھ کر اپنے پیر و مرشد کی نقل نہیں کی ـــــ اس لطیفے کا مطلب صرف اتنا ہے کہ جن ملکوں کی آبادی قریب قریب سو فی صدی مسلمان ہے وہاں کی ہر چیز اور ہر بات کو ہم اسلامی سمجھ بیٹھتے ہیں اور یہ بھول جاتے ہیں کہ ان ملکوں کی تہذیب میں بہت سے غیر اسلامی عناصر شامل ہیں۔

جب اپنی کئی تحریروں میں' میں نے اس بات پر زور دینا شروع کیا کہ اُردو ادب میں ہندوستان کی تہذیب و زندگی کو زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر جلوہ گر ہونا چاہیے تو پاکستان کے کچھ دوستوں نے یہ آواز اُٹھائی کہ پاکستان کے ادب کو صرف پاکستانی ادب نہیں بلکہ اسلامی ادب ہونا چاہیے شاید اس لیے کہ مشرقی پاکستان میں ایک کروڑ کے قریب ہندو ہیں اور وہاں کے مسلمان بھی رہن سہن اور زندگی کی پچانوے فی صدی باتوں میں وہاں کے ہندوؤں کے جتنے قریب ہیں مغربی پاکستان کے مسلمانوں سے اتنے قریب نہیں اور خود مغربی پاکستان میں پٹھانوں، پنجابیوں اور سندھیوں کی زندگی میں بہت کم مماثلت ہے۔ اسلامی ادب کے فقرے میں لفظ اسلامی کو ایک ایسا معجزہ سمجھا گیا جو نسلی و مقامی یا جنم بھومی کی خصوصیتوں کو مٹا کر رنگا رنگ زندگی کو ایک رنگ میں رنگ دے گا۔ شاید میرے عزیز دوست حسن عسکری اور آفتاب احمد صاحب کا بھی کچھ ایسا ہی خیال و گمان رہا ہے۔

اسلام ایک بہت بڑی حقیقت، بہت بڑی قوت، اور بہت بڑا انقلاب رہا ہے۔ عربی، فارسی، ترکی اور اُردو ادب اسلام کی روایات سے معمور ہیں، اور شاید اس حد تک معمور ہیں کہ اب انھیں غیر اسلامی عناصر سے مزید نشو و نما حاصل کرنا ضروری ہے۔ اور یہی ہو بھی رہا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اسلام کے وہ عناصر جو اب تک اردو ادب میں نہیں آسکے یا اچھی شکل میں نہیں آسکے آئندہ نہ لائے جائیں۔ ایسے عناصر فلسفیانہ مفکرانہ اخلاقی ہوں گے۔ رہن سہن یا خارجی زندگی کے جزدیات سے ان کا تعلق زیادہ نہیں ہوگا۔ اور یہ جزدیات جیسے اور جتنے آسکتے تھے آبھی چکے ہیں۔ رہے مناظرِ قدرت سو وہ مقامی یا جغرافیائی ہوتے ہیں اسلامی نہیں ہوتے۔ پاکستان کے مسلمانوں کی زندگی کے مسائل اسلامی کم ہیں انسانی اور اقتصادی زیادہ ہیں۔ وہاں کے لوگوں کی منظم کوششیں یا جد وجہد سیاسی، اقتصادی، صنعتی حرفتی، علمی ہوں گی نہ کہ اسلامی۔ اس لیے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ ابھی بہت سی قیمتی چیزیں اسلام اردو ادب کو دے سکتا ہے تو بھی پاکستان کے اُردو ادب میں مقامی اور عالمی عناصر مکانی و زمانی یا عصری عناصر کو اسلامی عناصر سے کہیں زیادہ اہمیّت ہو گی اور یہ اہمیّت پاکستان اردو ادب کو مل رہی ہے اور ملتی جائے گی۔ ہندوستان کا حقیقی جدید اُردو ادب بہت حد تک یا اکثر سو فی صدی حد تک پاکستانی ادب ہوگا اور پاکستان کا اُردو ادب ہندوستانی ادب ہوگا۔ بقول پاکستان ہی کے ایک شاعر کے۔

دوستو ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک
کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر

پاکستان کے مناظر سے منجوڈارو اور ہڑپا سے، پاکستان کے شہروں سے وہاں کی صنعت و حرفت سے اتنا ہی لگاؤ ہندوستانی کو ہوگا جتنا پاکستانی کو۔ دنیا اب ایک عالمی حکومت کی طرف گامزن ہے۔ ہماری جنگ آزادی سوشلسٹ انقلاب کی شکل نہیں اختیار کر سکی۔ اسی سے ایک قوم اور ایک ملک دو حصوں میں بٹ گیا۔ اب لوگ ایک زبان و ادب کو بھی دو ٹکڑے کر کے دیکھنا چاہتے ہیں۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ حالی و اقبال ہندوؤں کی بھی ملکیت ہیں۔ ٹیگور اور پریم چند مسلمانوں کی بھی ملکیت ہیں۔

اب ہندوستان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور کیفیتوں کو اُردو ادب میں زیادہ سے زیادہ جگہ دینے کی ضرورت کو سمجھیے۔ اس سلسلے میں تین نام ذہن میں لائیے۔ نظیر اکبر آبادی، پریم چند اور راقم الحروف۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی اور نام بھی لیے جا سکتے ہیں۔ ہم لوگوں کی کوششیں ہندوستانی زندگی کو اردو ادب میں زیادہ سے زیادہ اجاگر کرنے اور ابھارنے کی رہی ہیں۔ البتہ ایسا ہونے میں ہندوؤں کی زندگی کے مخصوص جلوے زیادہ نظر آئیں گے اس لیے ہرگز نہیں کہ ہندو اکثریت میں ہیں بلکہ اس لیے کہ کئی لحاظ سے ہندو زندگی زیادہ رنگارنگ اور پہلودار ہے۔ خارجی اور داخلی دونوں لحاظ سے۔ یہ رنگارنگی

اور پہلو داری اردو ادب میں اسی طرح آجانا چاہیے جس طرح وہ سنسکرت، پالی،
بنگالی، ہندی، ماگدھی، اُڑیا، پنجابی، مرہٹی، گجراتی اور جنوبی ہند کی زبانوں میں
ملتی ہے۔ ہندو زندگی جذباتی رشتوں Associations سے مالا مال
ہے۔ ان Associtions کو اپنا لینے سے مسلمان بہتر مسلمان بن
جائے گا۔ گھٹیا مسلمان نہیں بنے گا۔ اسلام کے یا جذباتی رشتوں کو اپنا کر
ہندو بہتر ہندو بنے گا، گھٹیا ہندو نہیں بنے گا۔ میری نظم جگنو نقوش ہی میں
شائع ہوئی تھی۔ ہنڈولا سیارہ میں شائع ہوا تھا۔ روپ کتابی شکل میں شائع
ہو چکی ہے۔ ان سب میں جذباتی رشتوں کا اظہار ہوا ہے جو ہندو زندگی کی
رنگا رنگی اور پہلو داری کو آئینہ دکھاتے ہیں۔ لیکن جو مسلمانوں کو بھی وجد میں لاتے
ہیں۔ ہمارا خون ایک ہے مغائرت کہاں تک ممکن ہے؟

ہمارا ملک ہندوؤں کی ملکیت نہیں ہے نہ مسلمانوں کی۔ یہ ملک بنی نوع
آدم کی مادرِ وطن ہے۔ آج بھی ہمارے سینوں میں تہذیب کی پہلی صبحیں سانس
لے رہی ہیں۔ ہمارے شعور پر خلقت کی دائمی ازلیت آج بھی منڈلا رہی ہے۔
ہمارا کفر ایمان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا ہے۔ کائنات وانسانیت کی
وحدت کے تصور سے آج بھی ہماری پلکیں نم ہو جاتی ہیں۔ بدھ کے چکر، کرشن
کی بنسی، مندروں کے گھنٹوں کی آواز اور اذان کی آواز سے ہمارے ملک کی
فضا گونجی ہوئی ہے۔ زندگی ریاستی یا سیاسی جھگڑوں سے بڑی حقیقت ہے اور ادب

بھی دو قوموں کی تھیوری سے بڑی چیز ہے۔

البتہ ہندوستان یا پاکستان کے ادب کو ہم غلطی سے ہندو ادب یا اسلامی ادب بتانے اور بنانے کی کوشش کریں تو کم از کم ایک غلطی نہ کریں۔ یعنی اس ادب کو باہم رجز خوانی کا آلہ یا حربہ نہ بنائیں۔ اس ادب کے ذریعے سے دوسری قوموں کو چیلنج یا چنوتی نہ دیں اور اس ادب کو کاغذ یا دفتی کا ایسا پردہ نہ بنائیں کہ ہم وطنوں، پڑوسیوں اور دنیا کی زندگی کو دیکھنے جاننے اور اپنانے کا امکان ہی مٹ جائے۔ بڑا ادب کسی قوم کے اپنی کھال میں مست رہنے کا ادب نہیں ہوتا۔ اس میں آفاقیت و مقامیت کا سنگم ہوتا ہے۔ علٰحدگی Separatism قوموں، تہذیبوں اور فنون کے لیے موت کا باعث بن جاتی ہے۔ ہم ہندوستانی ضرور ہیں لیکن کرۂ ارض یا کائنات کے بھی شہری ہیں۔

یہ خط خط کاہے کو ہوا ایک وعظ بن گیا۔ یہ سوچ کر کچھ شرم سی محسوس ہونے لگی کہ میں دوسروں کا ناصح مشفق بننے والا کون یا مانی جانی ہوئی حقیقتوں کو ایجاد بندہ کرکے پیش کرنا کہاں کی عقل مندی ہے! اس لیے معذرت کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

آپ کا خط مل گیا ہے۔ بعض باتیں غور طلب ہیں۔ کیسے تو غور کروں۔

آپ کا
فراق

۱۷

۸/۴ بنیک روڈ۔ الہ آباد

۳۱ دسمبر ۱۹۵۵ء

برادرم!

آج سال ختم ہو رہا ہے۔ انگریزی میں پرانے سال کی رخصت اور نئے سال کی آمد پر ٹینی سن کی نظم مشہور ہے۔ اُردو میں اس موضوع پر کوئی نظم دھیان میں نہیں آتی۔ اتفاق سے اپنی ایک نظم "تلاشِ حیات" کا خیال آگیا۔ اس نظم کے آغازی ٹکڑے سُنیئے:-

مہر کے گرد یہ زمیں کر چکی اِک طواف اور
قلب زماں مکاں میں آج پڑ گیا اِک شگاف اور

گنگ و جمن نے کروٹیں   بدلیں چمکتے درد سے
ہلتی ہیں رات کی لٹیں   موج ہوائے سرد سے

ایک چھپی ہوئی لکیر   شرق سے دے رہی ہے لَو
کانپتے ہیں کرن کے تیر   پھوٹتی ہے سنہری لَو

نیند کے آبشاروں نے   چونک کے آنکھیں کھول دیں
چشمے اُچھل اُچھل پڑے   نہریں اُبل اُبل پڑیں

ہند کے گھونگھٹوں تلے   کیسی سہانی آگ ہے
ماں کے دمکتے ماتھے پر   آج نیا سہاگ ہے

نوروز کے تصور سے متأثر ہو کر ہمارے کچھ اور شعرا بھی اس موضوع کو میں چاہتا ہوں کہ اُجاگر کریں۔

آج ایک عجیب خیال نہ جانے کیوں میرے دماغ میں آیا۔ جرمن شاعر گیٹے نے کالیداس کی شکنتلا کی جن الفاظ میں مدح سرائی کی ہے دُنیا کے کسی ادبی شاہکار کی ایسے الفاظ میں تعریف نہیں کی گئی۔ وہ کہتا ہے کہ پورے آفاق کی حقیقتوں کو ایک لفظ میں اگر میں بیان کر دینا چاہوں تو اے شکنتلا

میں تیرا نام لے لوں گا اور تمام حقیقتوں کا اظہار ہو جائے گا۔

شکنتلا ایک ہمہ گیر علامتی Symbolic تخلیق ہے۔ دیکھیں اس میں ہمارے زمانے کے واقعات کی پیشین گوئی ملتی ہے یا نہیں۔ رشی کے آشرم کو اشتراکی ممالک تصور کیجیے اور رشی کی ریاضت کو اشتراکی انقلاب کی جد و جہد سمجھئے۔ شکنتلا کو اشتراکیت سمجھئے۔ مہاراجہ دشینت کا شکار کے دوران میں شکنتلا کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو جانا دوسری جنگِ عظیم میں امپریلیسٹ ممالک کا سرمایہ دارانہ حکومتوں کا مجبوراً روس کا ساتھ دینا تصور کیجیے۔ شکنتلا اور دشینت کی شادی کو جرمنی کی شکست اور روس اور اس کے ساتھیوں کی فتح جانئے۔ پھر دشینت کا شکنتلا کو بھول جانا اور ایک بد دعا کے زیر اثر شکنتلا کو دربار سے نکال دینا۔ پھر شکنتلا کا بن باس اسے وہ ٹھنڈی جنگ (Cald War) یا بین الاقوامی تناؤ (Tension) سمجھئے جس کا مظاہرہ دنیا میں ہو رہا ہے۔ پھر بعد کو شکنتلا اور دشینت کا ملاپ ہم وجودی Co- Existence کے اصول کی امن کے آدرش کی اور اتحادِ عالم قائم کرنے کی کوششوں کی کامیابی اور فتح سمجھئے۔

اس طرح شکنتلا چند کرداروں کا ڈرامہ ہوتے ہوئے تاریخ کے سب سے اہم دور کا ڈراما بن جاتا ہے۔

آج کے خط میں کچھ ایسی ہی چلتی پھرتی باتیں کہوں گا۔ میں اس امر سے

اچھی طرح واقف ہوں کہ متعدد ادبی کارناموں میں کبھی کبھی اجتماعی عمل اور جدوجہد کا سیلاب آگیا ہے جس سے قوموں کی زندگی بدل گئی ہے اور تاریخ عالم سیراب وشاداب ہوئی ہے۔ لیکن عمل کا محض خارجی، تخصیصی یا محض مادی لحاظ سے فائدہ رساں تصور نامکمل اور ناقص تصور ہے۔ یہی دوسرے فنون لطیفہ کے بارے میں کہوں گا۔ شاہکارانہ مصوری، بیتھوون کی نویں سمفونی شیکسپیئر کے ڈرامے، اجنتا کا فن، یا فطرت کی فن کاری خلاً نغمۂ طیور، قوس قزح، آبشاروں کا نغمہ، پر طاؤس، ہرن کی آنکھ، پھولوں کی رنگینی و خوشبو، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر، ہمالہ کی تمکنت، تاروں بھری رات، صحراؤں اور ریگستانوں کی منظری عظمتیں اس لحاظ سے مقصدی یا افادی نہیں ہوتیں کہ ہم اجتماعی یا انفرادی جدوجہد میں لگ جائیں۔ جہاں مہذب عملیت سماج کے لیے ضروری ہے وہاں مہذب جمولیت بھی سماج کے لیے ضروری ہے، بہرکیف واثر تحریک عمل نہیں ہے عمل کی اہمیت مانتے ہوئے بھی تاثر برائے تاثر یا خالص وجدانی کیفیت برائے وجدانی کیفیت؛ احساس جمال برائے احساس جمال کی اہمیت بھی ماننا پڑتی ہے۔ ادب برائے ادب، فن برائے فن کے فقرے ذرا بدنام ہو چکے ہیں لیکن تاثر برائے تاثر برائے عمل نہیں محض برائے تاثر یا اس وجدانی جمالیاتی معجزے کا احساس جسے ورڈسؔ ورتھ یوں بیان کرتا ہے:

The Light That Never Was on Landorsea.
The Consecr Etation And The Poet,s Dream.

ہماری زندگی کی ایک ایسی داخلی ضرورت ہے جس کی تشفی ضروری ہے اور جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خارجی عمل سے قطع نظر کرکے داخلی طور پر زندگی کو برتنے اور سنوارنے کا کام کم اہم نہیں ہے۔ احساس برائے احساس کوئی الخطاطی یا کھوکھلا سلوگن نہیں ہے اور نہ یہ نعرہ رجعت پسندانہ نعرہ ہے۔ ہم ہر طرح کی قربانی کرکے کڑی سے کڑی ایسی محنت کرکے جس سے سماج پھلے پھُولے اچھے آدمی ضرور بنتے ہیں لیکن بے خارجی عمل اور بے ایثار کے بھی احساس جمال یا وجدانی کیفیت حاصل کرکے ہم شاید اور اچھے آدمی بن جاتے ہیں۔ عمل کی ایک نفوی حیثیت ہوتی ہے یعنی کسی برائی کو مٹانا، خارجی یا مادی کمی کو پورا کرنا یا حاجت روائی۔ وجدانی کیفیت کی اثباتی حیثیت ہے وہ اتنا برائی دُور نہیں کرتی جتنا اچھائی کو بہتر بناتی ہے۔ سماج کی وہ تمام اچھی قوتیں جو عمل کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں انسان کو اچھا بناتی ہیں۔ بغیر فنونِ لطیفہ کی مدد کے بھی۔ فنونِ لطیفہ اس عملی اخلاق نیکی اور اچھائی میں لطافتِ احساس کا اضافہ کر دیتے ہیں۔

جان سٹورٹ مل کی تمام زندگی بہتر سے بہتر انسانی سماج بنانے کی کوشش میں صرف ہوئی۔ لیکن وہ اپنی خواہشوں اور آدرشوں کی کامیابی کو یقینی مان کر بھی خودکشی پر آمادہ ہو گیا تھا۔ عین اُسی وقت ورڈس ورتھ کی نظموں کی جلد اس کے ہاتھ لگی جس کا اثر یہ ہوا کہ عملی لحاظ سے غیر مقصدی طور پر اسے کائنات وحیات کے جمال کا احساس ہوا اور وہ خودکشی سے باز آیا۔ کیا میں ایسی باتیں کر رہا ہوں

جسے تصوف یا عینیت کہہ کر ٹال دیا جائے؟

بھرپور کوشش سے کوئی کمیونسٹ یا اشتراکی سماج بیس پچیس پنج سالہ منصوبوں کی جب تکمیل کرے گا تو سارے خارجی عمل اور عملی مقاصد مشین پورے کرنے لگے گی۔ انسانی خارجی عمل سکڑتا جائے گا یا بقول اسٹالن پوری قوم انجنیئروں کی قوم بن جائے گی اس وقت فنونِ لطیفہ ہمیں پیغامِ عمل نہ دیں گے وجدانی کیفیتیں اور احساساتِ جمالی ہی گے اس لیے اگر ہمیں ادب کے سلسلے میں مقصد کا لفظ کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو خارجی مقصد کے علاوہ داخلی یا وجدانی یا کیفیتی مقصد کو ماننے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اسی داخلی مقصد کو مدِّ نظر رکھ کر ادب برائے ادب یا فن برائے فن کا اصول ماننا پڑے گا۔ یعنی ادب برائے زندگی اور ادب برائے فن کے تضاد و تصادم کو مٹانا پڑے گا۔

لاہور میں سردی کیسی پڑ رہی ہے۔ ان خطوں میں جو کام کی باتیں نکلیں انھیں بے شک چھاپ دیجیے۔ میں اپنی صحت کی طرف سے مایوس رہ کر اب کچھ بے نیاز سا ہو چکا ہوں۔

آپ کا
فراق

۱۸

ہندوستان و پاکستان کے کئی حلقوں میں ہندو ادب یا اسلامی ادب ، ہندوستانی تہذیب یا اسلامی تہذیب کی باتیں اُٹھتی رہتی ہیں اور تحریکیں چھڑتی رہتی ہیں۔ ایسے مسائل پر مناسب غور و فکر کرنا اور پھر صحیح اور کار آمد نتیجہ پر پہنچنا بڑی ذمہ داری کا کام ہے۔ ہمارا ادب و تہذیب بلکہ ہمارا اجتماعی شعور و کردار کیسا ہو ہماری قومی زندگی کا جسم و جاں کیسا ہو یہ سب باتیں فیصلہ کن حد تک اس پر منحصر ہیں کہ ہم جینے اور دنیا میں ترقی کرنے کے لیے کیا کیا کرتے ہیں۔ پہلے علم و تعلیم کو لیجئے۔ علوم ملکی ، مذہبی یا ملّی نہیں ہو سکتے ہیں۔ علم و تعلیم کے معاملے میں ہندوستان و پاکستان کے لیے دُنیا کے دوسرے غیر ہندو و غیر مسلم متمدن ملکوں اور قوموں سے کسی اہم لحاظ سے مختلف طریقہ اختیار کرنا ناممکن ہے۔

---

[1] یہ خط پہلے "اسلامی ادب" پر فراق کا مضمون ہے جو بعد کے خطوں کی بنیاد بنا۔

زراعت اور صنعت کے کاموں میں بھی غیر مسلم وغیر ہند و ترقی پذیر قوموں کے ساتھ قدم بقدم چلنا ہے۔ ہماری پوری اقتصادی زندگی، سیاسی زندگی، تمدنی زندگی تمام اہم امور میں اور اہم پہلوؤں میں بنیادی اور مرکزی تصورات میں اور بڑے مقاصد میں دُنیا کے بیدار ملکوں اور قوموں سے مختلف نہیں ہو سکتی۔

بہت سی چیزوں میں مثلاً ہندوستان کی زبان یا زبانیں اور پاکستان کی زبان یا زبانیں، غذا یا غذائیں، پہناوا یا پہناوے اور کچھ رسوم ایشیا اور یورپ یا دنیا کے دوسرے حصّوں سے مختلف رہیں گے۔ لیکن ان اختلافات کو جزوی یا فروعی سمجھنا چاہیے۔ تہذیب وتمدّن کے معاملے میں دُنیا ہندوستان و پاکستان سمیت بڑی تیزی سے ایک وحدت کی طرف بڑھ رہی ہے ایک اکھنڈ انسانیت کی تخلیق وتعمیر بہت تیزی سے ہو رہی ہے اور تمام ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں ڈھائی جا رہی ہیں۔ علوم ہی کے لیے نہیں بلکہ پوری تہذیب وتمدّن کے لیے۔ اب ایشائی یا یورپی مشرقی یا مغربی رہنا ناممکن ہو رہا ہے۔ نئی دنیا کی تاریخ یہ کلمہ پڑھ رہی ہے۔

پہلی غلطی تو ہم یہ کرتے ہیں کہ ہماری زندگی کی کچھ خصوصیتیں جو جغرافیائی اسباب سے پیدا ہوگئی ہیں انھیں ہم ہندو یا مسلم سمجھنے لگے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر بالفرض انگلستان کے باشندوں کا مذہب ہندو یا مسلم ہوتا تو بھی انگلستان کی تہذیب وہی ہوتی جو آج ہے۔ دوسری غلطی ہم یہ کرتے ہیں کہ ایجابی امور کو اثباتی

اور مان لیتے ہیں مثلاً اگر ہم ریل ایجاد نہیں کر سکے اور اُونٹ یا بیل کی سواری کرنے پر مجبور ہوئے تو اُونٹ اور بیل کی سواریوں کو ہندو یا مسلم تہذیب کہنے لگتے ہیں۔ اگر ہم ٹریکٹر سے کھیتی نہیں کر سکے تو قدیم طریقوں سے کھیتی کرنے کو ہندو یا مسلم طریقۂ زراعت مان بیٹھتے ہیں۔ اگر ہم جدید جمہوری سیاست یا مارکسی اشتراکیت کے اصول اور طریقے نہیں سوچ سکے تو رام راج یا خلفائے عہد حکومت کے سیاسی یا حکومتی انتظاموں کو ہندو یا مسلم تہذیب سمجھ بیٹھتے ہیں۔ جو علوم یا جیسا تمدن و تہذیب ہندوؤں اور مسلمانوں نے یا ان کے اسلاف نے وضع کیے۔ انھی کو ہم ہندو و مسلم زندگی سمجھتے ہیں۔ ہم ماضی کو دوام کا تاج پہنا دیتے ہیں۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارا ماضی ضرور ہمارا ہے لیکن ہم ماضی کے نہیں۔ ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ اب دنیا میں ترقی کے اصول اور طریقے باہم مختلف اور متضاد و متصادم نہیں ہو سکتے۔ ہندو یا مسلم اصولِ ترقی بے معنی فقرے ہیں۔

آیئے آج ہم اسی امر پر اکتفا کریں کہ کیا ہمارا ادب دُنیا کے دوسرے روشن ضمیر، بصیرت افروز، کردار ساز، حیات آور اور ترقی پسند ادب سے یا ایسے ادب کے معیاروں یا آدرشوں سے مختلف ہو سکتا ہے اور ان معنوں میں مختلف کہ وہ ہندو یا مسلم ادب کہلائے؟ میرے عزیز دوست پروفیسر محمد حسن عسکری نے بارہا اور برسوں سے اپنی متعدد تحریروں میں فرانس کے مشہور ادیبوں کی باتوں اور اُصولوں کو اس غرض سے دہرایا ہے کہ ہم ان کی باتوں کو ادب

اور سچائی سمجھ لیں۔ یہ اصول ادب کے متعلق مارکسی اصولوں سے لاکھ مختلف سہی لیکن بابا، فرانس کے ادیبوں کی یہ باتیں اور ان کے یہ اُصول مسلمان یا اسلامی یا پاکستانی کب اور کیسے ہوگئیں کیا عرب، ایران اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مفکّروں نے بھی ادب کے وہی اغراض و مقاصد بتائے ہیں جو ان فرانسیسی ادیبوں نے بتائے ہیں؟ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں اہلِ عرب نے افلاطون یا ارسطو سے ادب کے جو اصول حاصل کیے وہ اصول کیا اسلامی تھے۔ قرآن جس انسانیت کی تعمیر چاہتا ہے کیا فرانس کے وہ ادبا بھی جن کا ذکر ابھی آیا ہے، اسی طرح کی انسانیت کی تعمیر چاہتے ہیں اگر دنیا بھر کا بلند ادب ان زبانوں میں کامیاب ترجموں کے ذریعہ منتقل کر دیا جائے جنھیں مسلمان بولتے ہیں تو کیا یہ تمام ادب اسلامی ہو جائے گا فردوسی، سعدی، حافظ اور فارسی کے دوسرے مشاہیر کا ادب عربی ادب سے بہت مختلف ہے۔ ان میں اور عربی ادب میں اس سے زیادہ فرق ہے جتنا ان میں اور انگریزی یا جرمن ادب میں فرق ہے۔ تو فارسی ادب اسلامی رہا یا عربی ادب؟ یا بنگال کے جسیم الدین یا نذرالاسلام کا ادب اسلامی رہا جس میں دیگر "اسلامی" شاعری سے بعد المشرقین ہے؟ کیا میر حسن کی مثنوی اسلامی ادب ہے اور گلزارِ نسیم غیر اسلامی ادب ہے؟ کیا منٹو کے افسانے اسلامی ہیں اور کرشن چندر کے افسانے کافروں کا ادب ہے کیا اقبال کا ادب ان معنوں میں ادب ہے کہ اس کے بنیادی تصورات یا مرکزی محرکات یا اس کی داخلی رنگین کسی غیر مسلم شاعر کے یہاں مل ہی نہیں سکتیں؟ کیا شرر کے ناول اسلامی ادب ہیں اور رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد اور دوسرے ناول غیر مسلم ادب

ہیں ؟ سنسکرت زبان میں نل دمن کا قصّہ ہندو ادب ہے اور فیضی کی مثنوی نل دمن اسلامی ادب ہے ؟ جوش ملیح آبادی، علی سردار جعفری، احمد ندیم قاسمی ممتاز حسین کا ادب کیا غیر اسلامی ہیں اور دوسرے بہت سے دیگر مسلمان لکھنے والوں کا ادب اسلامی ہے ؟ کیا اقبال کی کچھ نظمیں غیر اسلامی یا خلافِ اسلام ہیں اور کچھ نظمیں اسلامی ہیں ؟ کیا غالب کے ایسے مصرعے یا اشعار

مرے بتخانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

یا

ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

یا

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

یا

دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یا میر کا یہ مصرع

مجھے تو شرم دامن گیر ہوتی ہے خدا ہوتے

یا ایسے مصرعے مثلاً

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست

غیر اسلامی ادب ہیں ؟ ایسی سینکڑوں مثالیں ہیں جو پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ حقیقتِ حال

شاعرِ ملت اقبال اور اب تک کے دوسرے ادیبوں کی رہی ہے ـــــ مگے ہاتھوں یہ بھی بے پوچھے نہیں رہا جاتا کہ پروفیسر عسکری صاحب کیا اپنے افسانوں اور دیگر تحریروں کو اسلامی یا پاکستانی ادب سمجھتے ہیں؟ کیا ماضی وحال کے کسی دوسرے ادیب کی تحریروں کو عسکری صاحب اپنی تحریروں کے مقابلہ میں زیادہ پاکستانی یا اسلامی سمجھتے ہیں؟

پھر یہ کیا قصّہ کھڑا کر رکھا ہے اسلامی پاکستانی یا غیر اسلامی وغیر پاکستانی ادب کا؟ احمد ریاض، ایک پاکستانی شاعر کی ایک نظم "الحاق" کے بارے میں عسکری صاحب کیا کہتے ہیں۔ نظم یوں شروع ہوتی ہے۔

دوستو ہاتھ بڑھاؤ کہ ہیں ہم آج بھی ایک
کون کر سکتا ہے تقسیم ادب کی جاگیر

اب ذرا ادب کے مستقبل پر نگاہ ڈالیے جہاں تک زبان اور اصناف کا تعلق ہے انگریزی ادب نے زبان کے اختلاف کے باوجود بہت سے اصنافِ ادب یونانی اور لاطینی زبانوں سے حاصل کیے ہیں۔ پھر یورپ کے مختلف ادبوں میں زبان کا فرق ہے اور بہت سے اصنافِ سخن سب زبانوں میں عام ہیں اور بہت سے مختلف۔ جہاں تک مجھے علم ہے یورپ کے کسی ادب کی تاریخ میں کوئی ایسی تحریک نہیں اُٹھی کہ ہمارا ادب عیسائی ادب ہو یا انگلستانی ادب ہو یا اطالوی ادب ہو یا ہسپانوی ادب ہو البتہ ہر ملک کا مقامی رنگ اور مقامی مزاج اور

قومی اسپرٹ یورپ کی مختلف زبانوں کے ادب میں ضرور رونما ہیں۔ پھر بھی یورپ کا ادب ایک پوری اکائی ہے اس میں ایک تسلسل اور کلچری یا تہذیبی اتحاد وہ وحدت ہے۔ مذہبی خصوصیت تو یوروپین ادب کا بہت اہم حصّہ ہے ہی نہیں بغور دیکھنے سے یورپ محض تہذیب کے لحاظ سے نہیں بلکہ ادب کے لحاظ سے بھی ایک پوری اکائی ہے۔ یورپ اور ایشیا کے ادب میں بھی اب تک رنگا رنگ اختلاف کے باوجود (اختلاف لیکن تصادم نہیں) انسانی تہذیب کے کلیوں کے لحاظ سے بہت کچھ یکسانیت رہی ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو جرمن شاعر گیٹے، کالی داس کی شکنتلا اور ایران کے شعرا کا قصیدہ نہ کہتا اور نہ اقبال شیکسپیئر یا سنسکرت کے ادیبوں اور مفکّروں کو خراجِ تحسین ادا کرتے۔ اس پس منظر میں ہمیں اب ادب کے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہیے۔

جو حضرات قابلِ افسوس، خود فریبی یا گمراہی کا شکار ہو کر کسی پاکستانی یا اسلامی ادب کا پاکستان میں خواب دیکھ رہے ہیں انھیں مندرجہ ذیل سوالات و مسائل کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۱۔ زراعت کی ترقی۔ صنعت و حرفت کی ترقی۔ علوم و تعلیم کی ترقی۔ حکومت کی خوش انتظامی۔ پاکستان کی آبادی کی ہر ممکن ترقی کے لیے وہ کون سے خیالات کون سی اسکیمیں یا پروگرام یا کون سے کام ایسے ہو سکتے ہیں جو اسلامی کہلائیں یا جو غیر مسلم ملکوں کے لوگ سوچ نہیں سکتے یا عمل میں نہیں لا سکتے۔ اگر

اسلامی ادب کے علمبردار اس سلسلے میں ایک بات بھی بتا نہیں سکتے تو یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ پاکستان کی آبادی کی ترقی جس ادب کے ذریعہ سے کرائی جاسکتی ہے وہ ادب اسلامی ادب نہیں ہوسکتا۔ دنیا کے کسی ملک کی ترقی یا اصلاح ہندوادب، عیسائی ادب، یہودی ادب، بودھ ادب یا اسلامی ادب کی مدد سے نہ کہیں ہو رہی ہے نہ ہوسکتی ہے۔ چنانچہ پاکستان کا صحت مند وصحت بخش ادب کسی لحاظ سے اسلامی ادب نہیں ہوسکتا۔ اسلامی نعروں کا یا کسی مذہب کے نعروں کا اُن تعمیری کاموں سے کوئی تعلق نہیں جن کے ذریعے سے کروڑوں پاکستانیوں کی مالی، ذہنی اور اخلاقی ترقی میں مدد مل سکتی ہے۔

۲۔ مشرقی پاکستان میں ہندو آبادی اتنی بڑی ہے جتنی کئی اسلامی اور غیر اسلامی ملکوں کی پوری آبادی نہیں ہے۔ مشرقی پاکستان میں اسلامی ادب اتنی بڑی ہندو آبادی کو اپنے ہاں کیا جگہ دے گا اور وہ ادب کس زبان میں ہوگا۔ کیونکہ وہاں کی بنگالی زبان محض ایک بولی نہیں ہے بلکہ کئی لحاظ سے اُردو سے زیادہ ترقی یافتہ زبان ہے۔ کیا مشرقی پاکستان کے لیے جس اسلامی ادب کی سعی لاحاصل کچھ لوگ کیا چاہتے ہیں وہ یہ بتائیں گے کہ اُس ادب سے وہاں کی اتنی بڑی ہندو آبادی کیا فائدہ اُٹھا سکے گی، کیا زندگی پاسکے گی؟ جس طرح پنجاب کی بولی پنجابی تھی اور ادب اُردو تھا اس طرح ہم بنگال کے بارے میں نہیں سوچ سکتے۔ وہاں کی بولی اور ادب دونوں کی زبان قدرت کے

اٹل قانون کے مطابق صرف بنگالی ہے اور رہے گی ــــــ اور اس بنگالی زبان اور ادب میں ہندو مسلم عوام کی ترقی کے لیے نہ کوئی اسلامی نعرہ کام آسکے گا نہ کوئی اچھوتا اسلامی پروگرام اور نہ کوئی مخصوص اسلامی جذبہ، نہ کوئی اسلامی تصورات۔

میرے عزیز دوست حسن عسکری صاحب نے اب تک ہزارہا صفحے خود لکھ ڈالے ہیں۔ میں اُن سے نہایت خلوص کے ساتھ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اُن کی تحریروں کے ان چند صفحات کو چھوڑ کر جن میں انھوں نے کوئی اسلامی ادب نہیں پیش کیا بلکہ اسلامی ادب کا صرف نعرہ لگایا یا اُن کی نوّے فی صدی تحریریں کیا اسلامی ادب ہیں؟ اُن کی ان تحریروں میں قرآن پاک، احادیث، اسلامی تاریخ مسلمان مفکروں کی تحریروں یا خیالات کے حوالے نہیں ملتے بلکہ سب کے سب حوالے اور مآخذ اُن فرانسیسی یا مغربی مصنفوں سے لیے گئے ہیں جنھیں اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر اقبالؔ کے ادبی کارناموں کا تصور بہت بڑا دھوکا پیدا کر سکتا ہے۔ اقبالؔ کے یہاں مرد مومن، خودی، حجازیت یا رہ رہ کر قرآن اور اسلامی تاریخ کے حوالے ایسے الفاظ اور ایسی چیزیں ہیں جو اسلامی ادب کا پُر فریب تصور لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیں۔ لیکن اگر ادب کو کسی ایسے عمل کی تلقین و تبلیغ کرنا ہے جو سمجھ میں آسکے جسے برتا جا سکے جو ایک منظم کوشش کی شکل میں سمجھایا دیکھا جا سکے تو یہ کہنا ناممکن ہوگا کہ زراعت، صنعت و حرفت، سیاست

اقتصادیات، تعلیم اور زندگی کے تمام شعبوں کے متعلق اقبال کی وہ کونسی تعلیم ہے جو کسی غیر مسلم فرد یا سماج کو سوجھ ہی نہیں سکتی یا جسے کسی غیر مسلم سماج میں عمل کا جامہ پہنایا نہیں جاسکتا۔ جب ہم ٹھوس انتظامی یا عملی شکل میں اقبال کے بلند آہنگ ادب سے کوئی بات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں کوئی آدھی اسلامی بات بھی ہاتھ نہیں آتی۔ خوبصورت نعرے۔ ذہن کی فضا میں موجیں مار کر رہ جاتے ہیں۔ اقبال کے کلام سے پیدا ہونے والا جوش پاکستان تو بنوا سکتا ہے لیکن پاکستان کے انتظام کے لیے پاکستان کی اجتماعی زندگی کے اہم جزئیات کے لیے اس کے کلام میں کچھ نہیں ملتا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان ہو یا ہندوستان یا دنیا کا کوئی ملک ہو آج اس کی زندگی یا تو ایک نیم مردہ زراعتی اور کچا مال پیدا کرنے والے ملک کی زندگی ہوگی یا انگلستان کی طرح سرمایہ دارانہ نظام کے تحت مشینوں پر منحصر زندگی ہوگی جو نوآبادیوں کو لوٹ کر ہی قائم رکھی جاسکتی ہے یا پھر روس یا چین کی زندگی سے ملتی جلتی اشتراکی زندگی ہوگی۔ قومی یا ملکی نظام کے اب ہندو ہونے یا مسلمان ہونے کے دن لد گئے لہذا قومی اور ملکی ادب کے اسلامی یا غیر اسلامی ادب ہونے کے دن بھی لد گئے۔

کچھ اور سوالات اسلامی ادب کے علمبرداروں کی خدمت میں پیش کرکے یہ مضمون ختم کرکے رخصت چاہوں گا۔ حسن عسکری صاحب اور اُن کے ہم خیال

سرسید احمد کی تفسیر قرآن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر قرآن یا انگریزی میں محمد علی قادیانی کا ترجمۂ قرآن یا پھر انگریز مصنف سیل (Sale) کے ترجمۂ قرآن کو کیا اسلامی ادب مانتے ہیں اگر ہاں تو ابوالکلام آزاد مسلم لیگ اور پاکستان کے مخالف رہے۔ محمد علی قادیانی تھے۔ سیل مشرف باسلام نہیں ہوئے ـــــ شبلی نے اکابر اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی سوانح عمریاں لکھیں اور ہمیشہ مسلم لیگ کے خلاف رہے ہندوستان میں پونے چار کروڑ مسلمان ہیں۔ ان میں جو ادیب ہیں اور حکومتِ ہندوستان کے خیرخواہ ہیں یا جنھوں نے پاکستان بننے کی مخالفت کی تھی۔ کیا یہ لوگ حسن عسکری صاحب کے نزدیک اسلامی ادب پیدا کر سکتے ہیں۔ کیا قاضی نذرالاسلام کا ادب اسلامی ادب ہے ـــــ کیا ترکی کے انقلابی اور اشتراکی شاعر ناظم حکمت کا کلام اسلامی ادب ہے؟ کیا خلیل جبران نے جو مسلمان نہیں تھے اور جن کی تصنیفیں عربی میں ہیں اور جنھیں عربی ادب میں ایک بلند مرتبہ حاصل ہے اسلامی ادب پیدا کیا؟ کیا جن فرانسیسی مصنفوں سے حسن عسکری صاحب روشنی اور ہدایت حاصل کرتے ہیں وہ اسلامی ادب پیش کرتے ہیں؟ کیا کشمیر کے وہ مسلمان شاعر و ادیب اسلامی ادب پیدا کرتے ہیں جن کی تصنیفوں کا کشمیر میں شہرہ ہے اور جو کشمیر کے مستقبل کے معاملے میں عسکری صاحب سے متفق نہیں ہیں۔ کیا افغانستان کا کوئی ایسا مسلمان مصنف جسے پاکستان سے سخت مخالفت ہے اسلامی ادب پیدا کر سکتا ہے؟ معاملہ محض اسلامی ادب یا اشتراکی ادب کا نہیں ہے بلکہ اسلام سے بے کراں محبت

رکھتے ہوئے ان مسلمان ادیبوں کا بھی معاملہ ہے جو ایسے سیاسی نظریے رکھتے اور پیش کرتے ہیں جو آپس میں متصادم ہیں اور جن میں ہر ایک خلوص کے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کی ترقی چاہتا ہے۔ دنیا بھر کے مسلمان، دنیا بھر کے اسلامی ممالک کو زندگی کے اُمور میں متحدہ سمجھنا میرے خیال میں تو اتنی ہی بڑی غلطی ہے جتنی دنیا کے عیسائی ممالک کو ان امور میں متحدہ سمجھنا۔ نہ عیسائی ممالک اپنے اپنے مفاد کی خاطر ایسا کریں گے اور نہ ہی اسلامی ممالک اپنی اپنی مصلحتوں کے باوصف ایسا کرنے پر آمادہ ہوں گے۔

رہی بات مقامی رنگ کی۔ پاکستان کے دریا پہاڑ یا وہاں کی سماجی زندگی میں جو یکسانیت یا اختلاف ہے۔ اس کی مصوری کرنا اور اسے اسلامی یا پاکستانی ادب سمجھنا، تو یہ ایک بے ضرر تصور رہے اگرچہ کئی لحاظ سے غلط بھی ہے۔ اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ہندو یا مسلمان ہونے کی کوئی قید نہیں۔

آپ کا

فراق

۱۹

برادرم محمد طفیل صاحب

فراق کا سلام محبت لیجیے۔ مئی۔ جون ۵۳ء کا نقوش ملا۔ اس شمارے میں اپنی غزل جو میں نے دیکھی تو مقطع پر اٹک گیا جو میں نے یوں لکھ بھیجا تھا اور جو یوں ہی چھپا بھی ہے ——

اسے فراق عشق ہے وہ اک شرر خود افروز
کہ جلا بھی نہ سکوں اور بجھا بھی نہ سکوں

اس مقطع میں کئی عیب ہیں۔ پہلے مصرعے میں یا تو فراق کی ق دبتی ہے یا عشق کی ح دبتی ہے۔ دوسرا عیب یہ ہے کہ شرر کو جلانا کیا۔ یہ عیب دوسرے مصرعے میں ہے۔ میرا اصل مقطع جو یوم غالب پر میں نے پڑھا تھا یوں ہے۔

عشق کی آگ ہے وہ آتشِ خود سوز فراق کہ جلا بھی نہ سکوں اور بجھا بھی نہ سکوں

میں نے اصلاح کرکے اپنے ہی بے عیب مقطع کا ناس مار دیا تھا۔ خیر جب ہومر بھی اونگھ جاتا ہے (Even Homer Nods) تو ہم لوگ کس شمار میں ہیں۔ بہرحال مجھے بھی جھپکی آگئی تھی۔ آپ سے اور قارئین نقوش سے معافی کا خواستگار ہوں۔

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی صاحب کا مضمون بھی اسلامی ادب کے متعلق اپنے مضمون کے جواب میں پڑھا۔ اس بحث کو میں اپنانا نہیں چاہتا۔ اس میں دوسروں کا بھی حصّہ ہونا چاہیئے۔ لیکن کچھ امور کی طرف توجّہ دلانے کو جی چاہتا ہے۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب کے جواب کا بہت بڑا حصّہ روحانیت بنام مادیت کی نذر ہوگیا ہے۔ میں نے اپنے مضمون میں یہ مسئلہ بالکل نہیں اُٹھایا تھا۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب نے روحانیت کے جن معاونوں کے بیانات یا احکامات پیش کیے ہیں ان میں ایک بیچارہ بھی مسلمان نہیں۔ اگر وہ روحانیت کے قائل ہیں تو ان کی روحانیت کو اسلام کیوں سمجھا جائے ـــــ شکسپیئر، دانتے، رابندر ناتھ ٹیگور، تلسی داس، سور داس، کالیداس ان سب کے ادب میں روحانیت جھلک رہی ہے اور کچھ میں تو کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، یہی حال بھگوت گیتا اور اپنشدوں کا ہے یہ تمام ادب روحانیت کا حامل تو ہے۔ روحانیت کی شاندار ترجمانی اور نمائندگی اس ادب میں ملتی ہے لیکن کیا ڈاکٹر فاروقی صاحب یہ کہنے کو تیار ہیں کہ یہ تمام آفاقی اور شاندار ادب اسلامی ادب ہے؟ ڈاکٹر فاروقی صاحب کو چاہیے تھا کہ

کہ وہ غیر اسلامی شاندار شہرۂ آفاق روحانیت اور خالص اسلامی روحانیت کے فرق کو واضح فرماتے۔

ڈاکٹر اقبال نے حافظ اور بہت سے ایران کے ایسے مسلمان شعراء کے کلام کو بالکل ناکارہ اور غیر اسلامی بتایا ہے جن کے یہاں روحانیت اور تصوف کی افراط ہے مشہور ترین مسلمان ادیبوں کے روحانی ادب کو ڈاکٹر اقبال نے اسلامی ادب نہیں مانا۔ ڈاکٹر اقبال کے نزدیک قریب قریب تمام ایرانی ادب اور مسلمانوں کا دیا ہوا قریب قریب تمام اُردو ادب عجمی اور غیر اسلامی ہے اور وہی ڈاکٹر اقبال، گرونانک، رشی وشوامتر (جسے وہ رفیق کائنات کہتے ہیں) بھرتری ہری وغیرہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں، سوامی رام تیرتھ کے گن گاتے ہیں شیکسپیئر کے متعلق ایسے شاندار الفاظ استعمال کرتے ہیں جو کسی اسلامی مصنف کے لیے انھوں نے استعمال کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ پھر غالب، داغ، امیر کے کارناموں کو بھی سراہتے ہیں۔ جب حقیقی اور شاندار ادب کا سامنا ہوتا ہے تو ڈاکٹر اقبال اسلامی اور غیر اسلامی ادب، اسلامی اور غیر اسلامی ادیب کے فرق کو بھول جاتے ہیں۔ جرمنی کے بالکل غیر اسلامی شعراء کو بے تکان خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

آیئے آگے بڑھیں۔ ہم لوگ ادب کا ذکر آتے ہی شاعری کا تصور کرنے لگتے ہیں۔ اس زمانے میں ناول اہم ترین صنفِ ادب ہے۔ بھلا کیسں

ناول اسلامی یا غیر اسلامی ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی مسلمان اُردو میں ناول لکھے تو وہ ڈکنس، وکٹر ہیوگو، تالستائی، گورکی اور ایسے ہی درجنوں غیر اسلامی ناولوں اور ناول نگاروں سے تو بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک ناول کا تعلق ہے ہمیں اسی طرح غیر اسلامی یورپ کی جاندار تقلید کرنا ہے جس طرح سائنس اور دیگر جدید علوم میں۔ مذہبی مقاصد کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر نذیر احمد یا شرر کے ناول لکھے گئے لیکن پریم چند کے ناولوں کے سامنے ان کی حقیقت کیا ہے۔ اسی طرح ناٹک یا ڈرامہ، سوانح عمری، تاریخ، مختصر افسانہ، تنقید، مضمون نگاری اور دوسرے تمام اصناف ادب اگر اسلامی ہونا چاہیں تو مضحکہ خیز ہو کر رہ جائیں گے۔ رہی شاعری تو ان چند چیزوں کو چھوڑ کر جہاں اسلام کی رٹ لگائی گئی ہے مسلمانوں کی بڑی سے بڑی شاعری ایسی چیز نہیں رہی ہے جسے غیر مسلم بڑا شاعر نہ پیش کر سکتا ہو۔ ایک مسلمان کالیداس یا پریم چند کے کارناموں کا مصنف ہو سکتا ہے اور ایک ہندو اقبال اور قاضی نذر الاسلام کے کارناموں کا مصنف ہو سکتا ہے۔ پورا ادب نہ نور نامہ ہوتا ہے نہ مذہبی عقائد کا اظہار۔ بلند تہذیب انسانیت کے نام پر ایسے مختلف شاندار ادبی کارنامے نہیں تصنیف کیے جاتے جو آپس میں ٹکرائیں۔ اخلاق، ادراک، زندگی کی بیش بہا قدریں، بلند نظریے فلاح و ترقی کے جو عناصر و محرکات کسی ایک بڑے مذہب میں ہیں وہی دوسرے بڑے مذاہب میں ہیں۔ اس لیے اگر ادب میں روحانیت کی ضرورت مان بھی لی جائے تو اُسے

روحانی ادب کیسے خواہ مخواہ اُسے اسلامی ادب کیوں کہیے ؟ یا صرف اسلامی ادب روحانی ادب ہے ؟ حقیقت تو یہ ہے کہ عربی ادب، ایرانی ادب، ہندوستانی ادب تو بامعنی فقرے ہیں، لیکن اسلامی ادب ایک مہمل فقرہ ہے۔ ڈاکٹر فاروقی صاحب کو ایسے مضمون کا عنوان رکھنا چاہیے تھا "روحانی ادب کیوں نہیں" نہ کہ اسلامی ادب کیوں نہیں ــــ

ڈاکٹر فاروقی صاحب اُردو کو صرف "اسلامیت" کا ترجمان سمجھ بیٹھے ہیں۔ اپنی ہندو ادیبوں کو اُردو میں وہ کامیاب بتاتے ہیں جو اسلامی روایتوں، اسلامی ناموں، اسلامی باتوں سے اپنے ادب کو سجاتے ہیں۔ پھر پریم چند اُردو کے سب سے بڑے افسانہ نگار اور ناول نگار گویا اسلامی ادب پیش کرتے ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، کنہیا لال کپور، چکبست یہ سب کے سب گویا اسلامی ادب پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ سب کے سب چوٹی کے اُردو ادیب ہیں ؟ رہیں ہندوستان کی اور زبانیں جیسے بنگالی، پنجابی، گجراتی، مرہٹی وغیرہ یا قدیم ہندی سو یہ سب بیچاری اس قابل کہاں کہ اسلامی ادب پیش کر سکیں۔ معلوم نہیں انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور دنیا کی اور مشہور زبانوں کے متعلق ڈاکٹر فاروقی صاحب کا کیا خیال ہے کیا یہ بیچاریاں اسلامی ادب پیش کر سکتی ہیں۔ اگر نہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر انگلستان، فرانس، جرمنی، رُوس، چین وغیرہ ممالک مسلمان ہو جائیں تو ان سب کو اپنی مادری، قومی، ادبی اور تہذیبی زبان اور علمی زبان بھی یا تو عربی، یا فارسی یا ترکی یا

پشتو یا اُردو بنانی پڑے گی۔ یا سارا ہندوستان اگر مسلمان ہو جائے تو اُردو کو چھوڑ کر یہاں کی سب زبانیں اور ان کے ادب بھی ختم ہو جائیں گے کیونکہ مسلمان ہندوستان میں صرف اسلامی ادب کی تخلیق و تعمیر کرے گا اور یہ صرف اُردو میں ممکن ہے۔

ڈاکٹر فاروقی صاحب نے اقبال کے لیے جو ہمارے دلوں میں احترام ہے اس سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہا ہے۔ اپنے مضمون کے آخر میں اقبال ہی کے نام پر انھوں نے تان توڑی ہے یہ کہتے ہوئے کہ ہمیں وہی ادب تیار کرنا ہے جس کا نمونہ اقبال دے گئے ہیں۔ یہاں پھر گذارش کر دوں کہ ناول، افسانہ نگاری ناٹک اور ادب کے بہت اصناف یہاں تک کہ خود شاعری کے بہت سے پہلو ایسے ہیں جنھیں اقبالی ادب سے مختلف ہونا پڑے گا۔ کسی زبان و ادب کا سب سے بڑا آدمی بھی مستقل طور پر اس زبان و ادب کو اپنے دئے ہوئے سانچوں میں مقید نہیں کر سکتا۔ البتہ مقدمہ شعر و شاعری کی طرح اقبال نے بھی کوئی مفصل و مکمل ادبی اعلان نامہ نثر میں نہیں دیا ہوتا تو اس پر غور کیا جاتا۔ میں اپنے پہلے مضمون میں صاف صاف بتا چکا ہوں کہ ڈاکٹر اقبال کا اسلامی ادب چند خوبصورت، دلفریب اور گوش فریب سلوگنوں سے نہیں آگے نہیں لے جاتا۔ مسلمان ہوں یا غیر مسلمان، یا تو ان کی ترقی یورپ یا امریکہ کے سرمایہ دارانہ نظام کی کامیاب تقلید سے ہو سکتی ہے جسے ترکستان بھی نہیں کر سکا یا روس، چین اور یورپ کی نئی اشتراکی جمہوریتوں کی کامیاب تقلید سے ہو سکتی ہے۔ کوئی اسلامی

طریقہ تین بتیس کروڑ مسلمانوں کے آزاد تعلیم یافتہ اور خوشحال ہونے کا نہیں ہے۔ ڈاکٹر اقبال کا اسلامی ادب مسلم عوام کی بیداری کا روشن ترین ادب نہیں ہے۔ اگر مسلمان ادیبوں کے دلوں میں مسلم عوام کے لیے درد ہے تو اقبالی ادب کی تقلید میں نثر و نظم لکھ کر وہ مسلم عوام کی تقدیر نہیں بدل سکتے۔ اقبالی ادب کوئی الہامی چیز نہیں ہے جس نے پہلے کے ادبی شاہکاروں کو منسوخ کر دیا ہو اور صرف حدیثوں کے بیلے یا ادبی شرع و فقہ کے لیے گنجائش چھوڑی ہو۔ مسلمان ادیب جتنا یورپ کی ترقی پسند نثر و نظم سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اتنا اقبالی ادب سے ہرگز نہیں۔

رہی بات مادیت دہریت اور روحانیت کی ننانوے فیصدی ادبی یا غیر ادبی کاموں میں یہ جھگڑا اٹھتا ہی نہیں۔ جب جنگل میں آگ لگتی ہے تو وہ تمام جانور جو ایک دوسرے کو کھا جاتے ہیں چپ چاپ ایک جگہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آج اس کی بالکل ضرورت نہیں کہ جو ادیب مادیت کے قائل ہیں اُن کا ایک محاذ ہو جو روحانیت کے قائل ہیں اُن کا دوسرا محاذ ہو۔ بھوک، بیکاری، بیروزگاری، چور بازاری، رشوت، زندگی کے ہر شعبے کی بدنظمی، سامراجی قوتوں کی سازشیں اور تخریبی کوششیں ہزاروں نوسو ننانوے آدمیوں کی بدحالی پاکستان، ہندوستان، ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بھی کئی ملکوں کی زندگی کو جہنم بنائے ہوئے ہے۔ پھر تیسری جنگ کا خطرہ مسلمانوں ہی کے لیے نہیں دنیا بھر کے لیے زندگی اور موت

کا سوال بن گیا ہے۔ اس وقت نمک حلال ادیب کے سامنے اسلامی اور غیر اسلامی دہریہ اور روحانی ادب کے سوالات نہیں ہیں بلکہ ایک طرح کی عام مصیبت میں گرفتار مسلم اور غیر مسلم دنیا کو ایک ہی مقصد کے ادب کی ضرورت ہے۔ یعنی ان عالمگیر بدعتوں کا شدید شعور پیدا کرنا، اجتماعی جد وجہد اور منظم تحریکوں کی اہمیت کا شدید شعور پیدا کرنا اور اپنے ملک، ایشیا، افریقہ اور یورپ کی عوامی تحریکوں کا ساتھ دینے کی آمادگی پیدا کرنا اور ان عملی محرکات کو اعلیٰ ترین ادبی تخلیقوں کے ذریعہ آگے بڑھانا۔ حال کا شعور اور حال میں جس روشن مستقبل کے امکانات دنیا بھر کے لیے پنہاں ہیں ان امکانات کا شعور یہی وہ اشتراکی واقعیت (Socialist Realism) ہے جس سے ہمارے ادب کی تخلیق ہوگی۔ یہ واقعیت نہ اسلامی ہے نہ عیسائی ہے نہ ہندو ہے بلکہ اشتراکی واقعیت ہے۔ دنیا کو عیسائی، مسلمان، ہندو یا بودھ ایسی ملتوں میں تقسیم کرنے کے دن لد گئے۔ اشتراکیت تو بڑی چیز ہے اگر ہندو، مسلمان یا بودھ یورپ اور امریکہ کے دورِ سرمایہ داری کی منزلوں کو طے کر سکے ہوتے تو اب تک مذہبیت سے بہت کچھ آگے بڑھ گئے ہوتے جیسے نام نہادی عیسائی یورپ اور امریکہ بڑھ گئے ہیں اور آج ہندو ادب اور اسلامی ادب کے لیے بے جان فقرے ہماری زبانوں پر نہ ہوتے۔

نیاز کیش
فراق

۲۰

برادرم ! سلام شوق

نقوش کا نیا شمارہ بابت اگست، ستمبر ۵۳ء ملا۔ یہ خط لکھ رہا ہوں۔ اپنے عزیز اور سچے دوست آفتاب احمد صاحب کی اس نگارش کے جواب میں جس کا تعلق اسلامی ادب پر میرے اس مضمون سے ہے جو غالباً اب سے چار یا چھ ماہ پہلے نقوش میں شائع ہوا تھا۔ لیکن پہلے اپنی اُس غزل کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو اسی شمارہ میں شائع ہوئی ہے۔ اس غزل کے دو شعر یوں شائع ہو گئے ہیں :-

کبھی پائے پائے ہوئے تجھے کبھی کھوئے کھوئے ہوئے تجھے
کبھی بے نیازِ تلاش ہے کبھی عشق مائلِ جستجو،

یہ کہاں سے بزمِ خیال میں امنڈ آئیں چہروں کی ندیاں
کوئی مہ چکاں کوئی خوں فشاں کوئی زہرہ وش کوئی شعلہ رُو

یہ اشعار یوں ہیں :-

کبھی پائے پائے سے ہم تجھے کبھی کھوئے کھوئے سے ہم تجھے
کبھی بے نیازِ تلاش ہے کبھی دل ہے مائلِ جستجو

یہ کہاں سے بزمِ خیال میں امنڈ آئیں چہروں کی ندیاں
کوئی مہ چکاں کوئی خورفشاں کوئی زہروش کوئی شعلہ رُو

پائے پائے ہوئے، کھوئے کھوئے ہوئے، بالکل غلط ہے،
دوسرے شعر میں خوں فشاں بے معنی ہے -

اسی غزل کا ایک اور شعر جو شائع شدہ غزل میں نہیں ہے - یوں ہے

کرے زندگی کو جو زندگی جو ہر ایک دل کو بنائے دل
تری جستجو ہے وہ جستجو تری آرزو ہے وہ آرزو

اب میں آفتاب احمد صاحب کے مضمون کی طرف آتا ہوں - مجھے اتنی باتیں کہنی ہیں :-

اگر ان بے شمار کامیاب اور مقبول کتابوں میں جو مسلمانوں نے تصنیف کی ہیں - اسلام کی روح، اسلام کی قدریں اور رنگارنگ مسلم تہذیبوں کا دین جیتے جاگتے روپ میں موجود ہے تو اسلامی ادب کا نعرہ لگا کر ہم تحصیلِ حاصل کیوں کریں - جب مسلمان کا تخلیق کردہ ادب ناگزیر طور پر اسلامی ادب ہوگا تو دینیائے ادب میں بھی اہلِ ایمان میں تبلیغ کی کیا ضرورت ہے - اگر یہ کہا جائے کہ کوئی

ادب اسلامی ادب ہوتا ہؤا بھی ناقص، نامکمل، گمراہ، انحطاطی، کمزور، اسلامی خودی یا سچّے اسلامی شعور سے نیم بہرہ یا بے بہرہ ہو سکتا ہے' یا جمود پسند رجعت پسند ہو سکتا ہے اس لیے صحت مند اسلامی ادب کے مقاصد کے تحت اسلامی ادب کی آواز اٹھانا ضروری ہے تو میں یہ کہوں گا اوّلاً اس تحریک کا نام اسلامی ادب کے بجائے اسلامی ادب کی اصلاح ہونا چاہیے۔ لیکن جہاں تک جمالیاتی، عقیقہ اخلاقی اور روحانی قدروں کا تعلق ہے مسلمانوں کی بہت سی بلند پایہ تصنیفات ان قدروں سے پہلے ہی سے مالا مال ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہؤا کہ اسلامی ادب کا نعرہ خالص اسلامی جمالیاتی شعور سے یا محض وجدان سے متعلق نہیں ہے بلکہ یہ نعرہ ادب کو ایک سیاسی یا ملّی مقصد کے ماتحت لانے کے لیے اُٹھایا جا رہا ہے جس کا ناگزیر نتیجہ ادب کے ذریعہ سے مسلمانوں میں احساس برتری پیدا کر کے مسلمانوں کو برخود غلط بنانا ہوگا۔ ادب میں حملہ آوری یا جنگجوئی کے عناصر پیدا ہو جائیں گے اور اسلامی ادب ایک خطرناک چیز بن جائے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں صاحب اسلامی ادب سے یہ مقصد ہے کہ مسلمانوں میں اپنی وحدت کا احساس بیدار کرنا ان میں حمیت و خودداری پیدا کرنا ایک صحت مندی شعور مسلمانوں میں پیدا کرنا اسلامی ادب کا مقصد ہے تو خاکسار یہ گذارش کرے گا کہ جب ننانوے فیصدی مسلمان موت سے بدتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ بھوک بے روزگاری اور ایسی ہی جہنمی لعنتوں کے شکار ہیں تو آپ کے یہ خوبصورت

اور خوش آہنگ مقاصد نہ ادب کے جادو سے حاصل ہوں گے نہ کسی اور چھو منتر سے۔ اب کسی مذہب و ملت و اُمت والوں کی زندگی کے مسائل مذہبی، ملتی اور اُمتی رہ ہی نہیں گئے ہیں۔ جیسے طاعون اور دوسری وبائیں، قحط، بیروزگاری وغیرہ اسلامی وبائیں نہیں ہیں نہ ان کے دماغ کا کوئی مخصوص اسلامی اکسیرِ اعظم ہے اسی طرح کوئی ایسا اسلامی ادب بھی تصور میں نہیں آتا جو ان وباؤں سے مسلمانوں کو بچا سکے۔ ایسا ادب جو ان لعنتوں سے مسلمانوں کو آزاد کر سے۔ اصلاحی ادب یا انقلابی ادب یا اشتراکی ادب ہو سکتا ہے جسے اگر مسلمان بنائیں گے تو بقولِ آفتاب احمد صاحب اس میں روحِ اسلام بھی ویگر غیر اسلامی مسائل و مقاصد کے ساتھ ساتھ سموئی ہوئی ہوگی۔ اسی طرح ان لعنتوں سے اپنے لوگوں کو آزاد کرانے کے لیے دوسرے مذاہب کے ماننے والے ادب کی تخلیق کریں گے تو ان مذاہب کی چاشنی کے ساتھ ساتھ غیر مذہبی مسائل اور ان کے غیر مذہبی حل ان کتابوں میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوں گے۔ لیکن ایسا ادب اسلامی ادب، ہندو ادب، عیسائی ادب، یہودی ادب، پارسی ادب، بدھسٹ ادب یا جینی ادب نہیں ہوگا۔ ادب میں سیاست، اقتصادیات، سائنس اور دیگر علوم کا نچوڑ آ سکتا ہے بلکہ زندگی میں محض حال و قال نہیں بلکہ حیرت پیدا کرنے والے ، ادب میں تمام علوم اور شاندار عملی نظریوں کا نچوڑ آنا ضروری ہے۔ لیکن یہ علوم اور نظریے اسلامی نہیں ہو سکتے۔ اگر ان کروڑوں انسانوں کی زندگی کو ان لعنتوں اور

وباؤں سے بچانا ہے جن کا ذکر اُوپر آچکا ہے ـــــ ایسے ادب کی تخلیق میں نہ ہندو نازک خیالی کام دے گی۔ نہ مسلم رنگین خیالی کام دے گی۔

۲۔ آفتاب احمد صاحب لکھتے ہیں "مگر آج فراق صاحب کا مطالبہ ہے کہ ادب کے ذریعے زراعت کی ترقی، صنعت و حرفت کی ترقی اور حکومت کی خوشں انتظامی کی اسکیمیں اور پروگرام پیش کیے جانے چاہئیں۔ اب میں اس سے زیادہ کیا عرض کروں کہ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بہ کجا

میری گذارش ہے کہ ادب میں اسکیمیں نہیں پیش کی جاتی ہیں۔ شیکسپیئر، ڈکنس، شیلی، کارلائل، رسکن، برنارڈشا، ایچ جی ویلس، ٹالسٹائی، ٹیگور، روماں رولاں، ہیوگو، گورکی، کتنے نام گنواؤں ان سب کے کارنامے محض وجدان اور جمالیاتی تخلیقیں نہیں ہیں۔ ان سب کا ادب مقصدی ادب ہے اور یہ مقصد ہرگز محض کسی مزاج یا کسی روح مذہب کی تشفی یا تہذیب یا تالیف نہیں ہے دور نہ جائیے حالی کی مسدس یا اقبال کی شاعری کو لیجئے۔ حالی کی مسدس میں سماج کی ترقی کے لیے آدھی بات بھی ایسی نہیں کہی گئی ہے جو خالص اسلامی ہو یا جسے دنیا کی تمام تہذیب یافتہ قوموں کی وراثت یا جاگیر نہ کہا جا سکے۔ بلکہ حالی بار بار مسلمانوں کو غیر مسلموں کی تقلید کی تلقین کرتے دکھائی اور سنائی دیتے ہیں۔ مسدس حالی تبلیغ اسلام نہیں ہے نہ اسلامی مزاج کا جمالیاتی شعور بیدار کرنے کے لیے

وہ لکھی گئی ہے۔ مخاطب ضرور حالی نے مسلمانوں کو کیا ہے لیکن کوئی خاص اسلامی رموز مسلمانوں کو وہ نہیں بتاتے ہیں۔ اقبال کے کلام میں جتنی کام کی چیزیں ہیں۔ وہ دنیا بھر کی تہذیبوں کی جان و ایمان ہیں بلکہ بہت کچھ تو اقبال نے غیر مسلم ادب سے پایا ہے۔ بہر حال ادبیاتِ عالیہ محض جمالیاتی یا وجدانی چیز نہیں ہوتے بلکہ مقصدی چیز ہوتے ہیں اور وہ زندہ مقاصد ہندو یا مسلم نہیں ہوا کرتے۔ ادبیاتِ عالیہ میں جن صفات یا عناصر کا تعلق عمل سے ہے انھیں اسلام یا کسی اور مذہب سے متعلق کرنا غلطی ہے۔ ان صفات و عناصر کا تعلق عام تہذیب انسانی کے مختلف ادوار سے ہے۔ ایسے ادب کے جمالیاتی شعور میں مذہب کارفرما ہو سکتا ہے لیکن کوئی خاص مذہب کارفرما نہیں ہوتا یا پھر ملکی یا نسلی روایتوں کی چاشنی ان میں ہوتی ہے

۳۔ آفتاب احمد صاحب نے میرے اس بیان کا بھی حوالہ دیا ہے کہ میں اپنی شاعری میں ہندوستان کے قدیم ادب کا مزاج سمونا چاہتا ہوں۔ اگر اسے ہندو قوم کا یا ہندوستان کی مٹی کا مزاج بھی سمجھا جائے گا تو اس کا مطلب کسی مخصوص مذہب کا مزاج نہیں ہوا۔ جس مزاج کو میں اپنی اُردو شاعری میں کچھ لا سکا ہوں وہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادب میں شروع سے کارفرما ہے۔ اور اردو میں اس انداز سے کارفرما نہیں رہا ہے جس انداز سے اُسے کارفرما ہونا چاہیے۔ میرے اس بیان سے اسلامی ادب کے نعرہ کے لیے جواز نہیں ڈھونڈھا جا سکتا۔ میرا مطلب تو صرف اتنا تھا کہ اردو ادب کے مزاج میں ہندوستانیت

اسی طرح کوٹ کوٹ کر بھر جائے جس طرح عربی ادب میں حجازیت یا ایرانی ادب میں ایرانیت ہے اور بس۔ اردو ادب میں بقول آفتاب احمد صاحب کے اسلامی مزاج پہلے سے موجود ہے اس لیے مجھے تو یہ حق پہنچتا ہے کہ اُردو ادب میں ہندو سماج کا مزاج بھی آجائے لیکن اُردو میں اسلامی مزاج لانے کی تلقین یا تو تحصیل حاصل ہے یا جیسے کہہ چکا ہوں یہ تلقین اُردو ادب میں ایک فاشزم (Fascism) پیدا کرنے کی ترغیب ہے۔ اگر فردوسی، خاقانی، رومی، حافظ سعدی اسلامی ادب ہیں تو دنیا بھر اس ادب کو کلیجے سے لگائے رکھے گا، مسدس حالی کو بھی سب لوگ پیارا ادب کہیں گے۔ میر و غالب کو بھی اگر اسلامی ادب کہنے پر اصرار ہے تو اس ادب کو بھی غیر مسلم اتنی ہی اچھی طرح سمجھتے ہیں اس سے اتنا ہی لطف اندوز ہوتے ہیں جتنا کوئی مسلمان۔ لیکن اقبال کا شکوہ جب کوئی سمجھدار غیر مسلم پڑھتا ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور جواب شکوہ پڑھ کر ہنسی آجاتی ہے۔ اقبال کے کلام کا وہ تمام حصہ جس میں مسلم سامراج کے مٹنے کا ماتم ہے اگر اسے ہم بہت اہم اسلامی ادب سمجھیں تو واضح رہے کہ یہ اسلامی ادب دنیا کے بلند ترین ادبی مذاق رکھنے والوں کی نظر میں ہرگز قابل قدر چیز نہیں۔ معلوم نہیں جو لوگ اسلامی ادب کی رٹ لگاتے ہیں۔ وہ اقبال کا ادب چاہتے ہیں یا کیسا اسلامی ادب چاہتے ہیں۔ میری نظر میں تو اقبال کے ادب کا بہت سا حصہ ان معنوں میں اسلامی ادب ہی نہیں کہ وہ مسلمانوں کے

مزاج کے کسی پیارے یا خوش گوار پہلو کی ترجمانی ہو۔ اقبال کے ادب کا یہ حصّہ محض ایک ملّی فاشیت ہے یا بلند آہنگ جنگجوئی ہے۔ آج عرب، سیریا، مصر، ایران، افریقہ کے مسلمان اپنی زندگی کو آگے بڑھانے کے لیے اسلام سے یا اسلامی ادب سے کوئی کام نہیں لے رہے ہیں بلکہ عالمگیر سیاسی تحریکوں سے انقلابِ روس و انقلابِ چین سے، اشتراکیت سے مدد لے رہے ہیں اور غیر اسلامی ادب سے اپنی قوم کو بیدار کر رہے ہیں۔ ناظم حکمت کا ادب نہ اسلامی ادب ہے نہ اقبالی ادب ہے۔

۴۔ میری جن تنقیدوں یا میری شاعری کے جن نمونوں کو آفتاب احمد صاحب نے اتنے خلوص سے سراہا ہے وہ بہت خوبصورت بھی سہی لیکن ان کے آگے کیا میرے لیے کوئی منزل نہیں ہے؟ ادب میں مزاج کی اہمیت بتانے کے بعد کیا میرے لیے ادب میں کسی اور چیز کی اہمیت بتانے کی گنجائش نہیں رہی بنجارہ نامہ یا ڈاکہ دیس عوامی نظمیں ہیں۔ لیکن شام تہادت، دھرتی کی کروٹ، داستانِ آدم، روٹیاں، انقلابِ چین کیا میری یہ نظمیں میری غزلوں سے بہت کم ہیں۔ اگر ہیں تو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ جمالیاتی یا عشقیہ شاعری کے مقصد سے بلند مقصد کی نظمیں لکھنے میں مجھے اتنی کامیابی نہیں ہوئی۔ مگر اس سے بلند تر مقصد کو تو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ بہت سے لوگ تو بانگِ درا کے ہی اقبال کو مانتے ہیں۔ حالی کو لوگ کہتے تھے کہ ع

حالی غزل کو چھوڑ مسدس پر آ رہے ہے۔

میتھو آرنلڈ نے Empedvcles IN Epna جو اس کا شاہکار مانا گیا ہے اسے اپنے مجموعے میں جگہ دینا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس نظم میں ایک حسین اور دلکش مجہولیت کا جذبہ کارفرما ہے۔ اپنے بارے میں یہ کہوں گا کہ میری شاعری کا بڑا حصّہ اس لیے عشقیہ و جمالیاتی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکا کہ جاگیردارانہ اور سامراجی دور یا طبقوی سماج کی روائتوں کا مجھ پر گہرا اثر تھا۔ زندگی کے متعلق نیا شعور میرے اندر بہت آہستہ آہستہ اور بہت دیر میں پیدا ہوا۔ میری جس شاعری اور میری جن تنقیدوں کا ذکر آفتاب احمد صاحب اتنی محبت سے کرتے ہیں وہ میری نظر میں حرفِ آخر نہیں ہیں۔ اجتماعی زندگی کی شاعری تو دنیا میں ابھی شروع ہوئی ہے۔ کوئی اس عالمگیر روحانی انقلاب کی اہمیت نہ مانے تو اس کا کیا علاج۔

۵۔ آفتاب احمد صاحب مجھ سے پوچھتے ہیں کہ فنون اور خیالات کی آزادی اس روس و چین میں کتنی ہے۔ جس روس و چین کا میں اتنا مداح ہوں۔ ممکن ہے کچھ بے انصافی یا غلطی اس معاملے میں روس و چین میں ہوئی ہو لیکن ان ملکوں کے نئے ادب کے وہ کامیاب نمونے جن کی داد دنیا بھر میں دی گئی ہے انحطاطی سرمایہ دارانہ ادب کے بہترین نمونوں سے بلند تر ہیں۔ روس، چین اور دوسرے اشتراکی ملکوں سے باہر جو ادب اشتراکیت کے مخالف پیدا کر رہا ہے

وہ ہمیں زندگی و روشنی نہیں دے رہا ہے۔

آخر میں میری یہ گذارش ہے کہ ادیبوں کو یہ نصیحت آپ دینا چاہتے ہی ہیں تو ضرور دیں کہ بھائی مسلمانوں کے رسم و رواج، ان کے برتنوں، کپڑوں، غذاؤں، تیوہاروں، عقائد کو جی کھول کر ادب میں جگہ دو تاکہ ہمارا ادب زیادہ سے زیادہ اسلامی ادب ہو جائے اور زیادہ سے زیادہ اس کا مزاج اسلامی مزاج ہو جائے۔ لیکن اس سے مسلمانوں کی زندگی میں وہ گرمی اور حرکت نہیں پیدا ہوگی نہ وہ بلند جمالیاتی اور وجدانی احساس پیدا ہوگا جس کا پیدا کرنا اُس بلند ترین ادب کا مقصد ہے جو اسلامی نہیں ہوا کرتا۔ لُٹی ہوئی مسلمان قوم کے پاس خلافت کے عہدِ زرّیں یا دربارِ اکبری یا دربارِ عالمگیری کی دولت و ثروت آج کہاں ہے۔ آج تو ہر ملک کے مسلمانوں کو اور غیر مسلمانوں کو بھی کسی غیر مذہبی قوت سے اپنی تقدیس سنوارنا ہے۔ اس میں ایک بہت بڑی قوت ایسا ترقی پسند ادب ہے جو نہ اسلامی ہوگا نہ عیسائی نہ ہندو، اور جس کا مزاج اگر کچھ اسلامی ہوگا تو اس سے کئی گنا زیادہ غیر اسلامی ہوگا۔ یعنی مذہب و ملت کی آلائشوں سے پاک صاف۔

یہ سب باتیں میں نے اپنے سابق جمالیاتی نظریوں سے توبہ کر کے یا ان کی تردید میں نہیں کہی ہیں بلکہ ان نظریوں میں نئے اضافے، نئی معنیں

پیدا کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے لکھی ہیں۔ دنیا میں آج ایک عالمگیر تہذیب اور عالمگیر ادب کی مبارک تحریک جاری ہے۔ یہ وقت اسلامی ادب کا نعرہ لگانے کا نہیں ہے۔

آپ کا بھائی
فراق

(٢)

اُردو شاعروں میں جس آہستگی، سست روی، میانہ روی، جس خرامِ سکوں نما کے ساتھ فراق کی شہرت ہوئی اور بڑھتی رہی وہ اُردو شاعری کی تاریخ میں آپ اپنی مثال ہے۔ فراق نے اپنی زندگی کے اٹھاونویں برس میں قدم رکھا ہے۔ شاعری انھوں نے اپنی عمر کے بیسویں سال میں شروع کی، اور اُن کی شہرت کا آغاز جب ہوا تو وہ چالیسویں برس میں قدم رکھ چکے تھے اس طرح بیس برس کی مشق کے بعد تمام ہندوستان کی نگاہیں اُن پر اُٹھنے لگیں۔ جو نرمی، آہستگی اور جو ٹھہراؤ فراق کے پورے کلام میں ہے، جس طرح دھیرے دھیرے فراق کی آواز فضائے شاعری پر مستقل طور پر منڈلانے لگی۔ اسی طرح دھیرے دھیرے دُنیا اُن سے متعارف بھی ہوئی۔ یہ تعارف اور شہرت یہ دیر آشنائی ایک صحیح عملی تنقید اور جوہر شناسی کی حیثیت رکھتی ہے شاعری کی جو نئی قدریں فراق نے ہماری ادبی تہذیب کو دی ہیں اُن قدروں تک رسائی محض طباعی یا ذکی الحسی یا بے اختیارانہ وجدان یا تیز و تند دماغ کے

بس کی چیز نہیں ہے۔ اِدھر بارہ پندرہ برسوں سے جس کثرت سے فراق کی شاعری پر مضامین نکلے ہیں، اقبال کو چھوڑ کر کسی دوسرے شاعر پر اتنے اور ایسے مضامین نہیں نکلے اور پھر بھی ہر مضمون بہت کچھ کہتا ہوا تشنگی کا احساس کراتا ہے اور یہ مضمون بھی تشنہ ہی رہے گا۔ فراق پر بہت نازک تنقیدی احساس و ادراک کے ساتھ ایک مستقل کتاب کی ضرورت ہے۔ ان سطروں میں فراق کے رنگارنگ کلام کے صرف چند پہلوؤں پر کچھ قریب اور کچھ دور سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی لیکن اس سے پہلے اُن چیزوں کا کچھ ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے داخلی اور خارجی طور پر فراق کی زندگی، کردار، ذہنیت اور وجدانی ردِّعمل کو اور اُن کی خلّاقانہ صلاحیتوں کو متاثر کیا۔

پہلا اثر — ہندو تہذیب اور نظریے کا وہ حصّہ جو مادی دنیا کی طہارت کا احساس کراتا ہے، قدیم ہندو ادب اور ہندو زندگی کی فضا کے ساتھ ساتھ انگریزی شاعر ورڈسورتھ کے کلام کا مطالعہ اور دنیا کے بلند ادب کے کچھ حصے۔ شعرِ فراق کی داخلی تعمیر و تہذیب میں مدد دیتے رہے مثلاً ورڈسورتھ کے بہ مندرجہ ذیل مصرعے :-

THIS EARTH

WHIGH IS THE WORLD OF ALL OFUS AND
WHERE
WE FIND OUR HAPPINESS, OR NOT AT ALL'

دل جن کے فلک سے اٹکے ہیں دھرتی کی وہ عظمت کیا جانیں
میں اس کے قدم پر کنگرۂ افلاک کو بھی خم کرتا ہوں

اردو شاعری میں فراقؔ کو ایسا محسوس ہوا اس زمین پر اپنا گھر بسایا ہی نہیں تھا بلکہ ایک سطحی بسیرا لے رہی تھی۔ قبولیتِ حیات وکائنات کی اثباتی قدریں فراقؔ سے پہلے جم کر اُردو شاعری میں نہیں آئی تھیں۔

دوسرا اثر ــــ میرؔ اور دورِ میرؔ کے دوسرے قدیم دہلوی شعرأ کا مطالعہ جہاں جذبات وزبان میں وہ نرمی اور معصومی ہے جو لکھنوی شعرأ کے یہاں تصنع اور تکلف میں بدل جاتی ہے۔ فراقؔ کے ہمعصروں میں میرؔ اور دورِ میرؔ کے شعرأ میں فراقؔ کی طرح کوئی متأثر نہیں۔

تیسرا اثر ــــ مغربی فلسفہ وادب اور مغربی تہذیب کی بلند فکریات بلند سنجیدگی اور بلند قدریں فراقؔ کو مستقل طور پر متأثر کرتی رہی ہیں اور اُن کی خلاقانہ صلاحیتوں کی آبیاری کرتی رہی ہیں۔

چوتھا اثر ــــ فارسی شاعری میں کئی ہزار برس پُرانی تہذیب کی گنگی سے جذبات اور وجدان کی جو چاشنی پیدا ہو گئی ہے وہ بھی فراقؔ کے شعور میں جذب ہوتی رہی ہے۔ اُردو شاعری کی صوتیات فراقؔ سے پہلے فارسی شاعری کے لہجے کی کئی تہیں چھوٗ نہ سکی تھیں۔

پانچواں اثر ـــــ انگریزی حکومت کے بعد ہندوستان کی نشاۃِ ثانیہ اور سیاسی بیداری نے فراق کی شاعری میں ایک اُبھار، اقدار پرستی اور ایک وجدانی ایمان کی نشوونما کی۔

چھٹا اثر ـــــ ۱۹۳۶ء میں سجاد ظہیر اور اُن کے ساتھیوں کا ایک نیا اثر فراق کے شعور پر پڑا اور مارکسیت کا فلسفہ بہت مہذب اور متمدن یا ترقی یافتہ شکل میں فراق کے شعور پر چھانے لگا۔ فراق کے وجدان میں جو شرافت شروع ہی سے تھی، حیات و کائنات پر جس طرح اُن کا ایمان قائم ہو چکا تھا اُس نے مارکسیت کو قبول کرنے کے لیے سے زمین تیار کر رکھی تھی۔

ساتواں اثر ـــــ حسنِ فطرت اور حسنِ انسانی کا نرم ترین اور شدید ترین احساس۔ اس کے ساتھ ساتھ بلند ترین اخلاقی نظریہ۔ ان چیزوں نے مل کر فراق کے لب و لہجہ کو ایسا سنوارا کہ اُردو شاعری میں اُن کا ایک خاص مستقل مقام بن گیا۔ بقول ایک نقاد کے، میرؔ کے بعد اتنا بڑا عاشق شاید زمینِ ہند سے اُٹھا ہی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ احساسِ جمال تو اُردو شاعری میں اس رچاؤ کے ساتھ فراق سے پہلے آیا ہی نہیں تھا۔

اب آیئے فراق کی غزلوں پر کچھ تبادلۂ خیالات کریں۔ اُردو غزل کا ذخیرہ اندازاً چالیس پچاس لاکھ اشعار تک پہنچتا ہے۔ شاید اس سے بھی بہت زیادہ ہو۔ اس ذخیرے کا بیشتر حصہ محض قافیہ پیمائی ہے اور تاثیر سے محروم ہے

جو حصہ کیف و اثر رکھتا ہے وہ بھی بیشتر غمزدگی کا شکار ہے۔ فراقؔ کی غزلوں میں جو مرکزی صفت یا عنصر ہم پاتے ہیں وہ یہ ہے کہ بجائے غم و نشاط کے عشقیہ زندگی اور عام زندگی کے متعلق ایک وجدانی ادراک ہمیں ملتا ہے۔ جسے ہم بجائے جذبات نگاری کے گہری تنقیدِ حیات کہہ سکتے ہیں۔ فراقؔ کی غزلیں زندگی کا وہ احساس دیتی ہیں کہ زندگی پر ہمارا ایمان مستحکم ہو جاتا ہے۔ وجود کے کچھ ایسے صفات یا عناصر کے اثرات معلوم ہونے لگتے ہیں کہ جو بذاتِ خود نہ غم ہیں نہ نشاط زندگی سے متاثر ہونے کی شکلیں غم و نشاط ہیں جن کی تہہ میں ایک خالص وجدانی درک یا شعور ہے۔ یہ احساس اور ادراک فراقؔ کی غزلوں کی جان ہے۔ یہ فکریاتی عنصر فراقؔ کی غزلوں کو غیر معمولی توانائی اور زندگی بخشتا ہے۔ محض باتوں اور بیانوں کی شکل میں یہ فکریاتی عنصر کو دیتا ہوا نظر نہیں آتا۔ بلکہ اس کی آنچ اور روشنی، اس کا سوز و گداز فراقؔ کے اُس لہجے میں ملتا ہے، اُن کی غزلوں کی اُس صوتیات میں ملتا ہے۔ جن میں ایک انتہائی مہذب انسانی شعور جاری و ساری ہے۔ غم، خوشی، اُداسی، شگفتگی، کرب، راحت، سکون، حرکت، ناکامی، کامرانی، خیر و شر، گناہ و ثواب ضدین کے تمام جوڑے حقیقت کی مرکزی فطرت کے مُس سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ جیسے جیسے فراقؔ کا مذاق ترقی کرتا گیا، فراقؔ کی غزلوں میں یہ احساس بھی رونما ہونے لگا کہ وجدانی طور پر کائنات سے متاثر ہو کر رہ جانا ہی کافی نہیں ہے بلکہ دنیا سے ہم آہنگ ہو کر دنیا کو بدلنا بھی ہے اُسے نکھارنا اور سنوارنا بھی ہے۔ فراقؔ کی غزلوں میں ایک بالکل نئی تاثیر ہمیں ملتی ہے

جو پیدا وار ہے اُس نئے شعورِ حیات کی جسے فراق سے پہلے اُردو کے کسی غزل گو شاعر نے نہیں دیا ہی نہ تھا۔ کیا ہم اس بات کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ فراقؔ کے تفکر میں اور ان کی شاعری میں عجمیت اور حجازیت کا ایک سنگم ملتا ہے۔ حیات و تہذیب کے یہ دونوں نقطۂ نظر گھل مل کر فراق کی شاعری میں ایک ہوگئے ہیں فراقؔ کا شعور نہ محض وجدانیت زدہ ہے نہ محض عمل زدہ ہے۔ عمل کی سوجھ بوجھ اور عمل کی قوت کائنات کے وجدانی ادراک کی پیداوار ہے۔ فراق کا تصورِ عمل نہ ہیجانی ہے اور نہ اسے بخار چڑھا ہوا ہے۔ اس تصور میں قلب و نظر، سکون و توازن، نرمی و محبت اور خیر و برکت سبھی کچھ ہمیں ملتا ہے، وہ بے صبری، پیاس کا وہ تڑکا، خون کی وہ چاٹ جو اقبالؔ کے شاہیں کے تصوّر میں ایک ناخوشگوار انداز سے کارفرما ہیں، فراقؔ کے یہاں ایک پیامِ محبت کے انداز میں نظر آتے ہیں۔ صرف کہیں کہیں فراقؔ کی شاعری میں جلالی رنگ پیدا ہوگیا ہے، مگر اس رنگ میں بھی جمال کی جھلک نظر آتی ہے۔ فی الحال تو فراقؔ کی غزلوں کا ذکر ہے اور ہم اتنی باتیں کہنے پر ہی اکتفا کریں گے کہ فراقؔ نے جس طرح ہمیں عشق کرنا سکھایا اُس میں جن کمی عناصر کا اضافہ کیا، حسن و عشق کے تعلقات اور داخلی ارتباط اور رفاداری ہم آہنگی کا جیسا احساس کرایا جس طرح جذباتِ عشق کو فکریات کا مرتبہ دیا وہ فراقؔ سے پہلے اس کامیاب شکل میں کسی اور شاعر کے یہاں ہمیں نہیں ملتا۔ پھر فراقؔ نے عشقِ حقیقی کا ڈھونگ بھی

نہیں رچایا۔ جنسی عشق، وہ عشق جس میں شہوانی تلذذ، کو ایک مرکزی حیثیت حاصل ہے اُسے فراقؔ نے ایسی نزاکتیں اور بلندیاں عطا کیں اور اُسے اتنا پاکیزہ بنا دیا کہ ہمیں اپنی شہوانیت سے آنکھ چرانے اور شرمانے اور اُس کے متعلق باتیں بنانے کی بالکل ضرورت نہیں رہی۔ شہوت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فراقؔ نے وہ عشقیہ اشعار کہے ہیں جن میں شہوانیت ہمارے کلچر کا ایک پاکیزہ جزو بن جاتی ہے۔ یہ بھرم ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا ہے کہ جنسی خواہشات و رجحانات ہوس پرستی ہیں۔ اور وہ اس طرح کہ فراقؔ کے عشقیہ اشعار میں ولمیت اور خلوص کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ فراقؔ نے اس سنجیدہ حماقت کو کبھی تسلیم نہیں کیا کہ جنسیت صرف بقائے نسل کے لیے ہے۔ رموزِ جنسیت اس سے بہت گہرے ہیں۔ تحریک و ترغیبِ جنسیت معشوق سے جو ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ اُسی کے ساتھ ساتھ پوری انسانیت اور آفاق سے بھی آدمی کے اندر محبت و ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ ہماری مکمل جذباتی زندگی کی تہیں بلکہ اس کے سرچشمہ جنسیت میں پوشیدہ ہیں۔ محبت معشوق اور محبت کائنات لازم و ملزوم ہیں۔ اسی سے فراقؔ کی عشقیہ شاعری میں بیک وقت داخلیت اور آفاقیت پیدا ہوگئی ہے۔ اُردو شاعری کا لہجہ فراقؔ کی غزلوں میں نہایت آہستگی سے بدل جاتا ہے۔ خشکی اور سطحیت، درشتی اور خشونت، رسیلے پن، گہرائی، نرمی اور چمکار سے بدل جاتی ہیں۔ چند اشعار ہی اس مختصر مضمون میں

پیش کیے جا سکتے ہیں ورنہ فراقؔ کے یہاں حسن و عشق سے متعلق جس کثرت سے نئے اور سچے مضامین آئے ہیں وہ فراقؔ کی غیر معمولی خلاقانہ صلاحیت کی گواہی دیتے ہیں۔ فراقؔ کی طبیعت کی اس اُپج سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ اُن کی بہت سی غزلیں بجائے مختصر ہونے کے طویل ہوگئیں۔ اب اسے آپ جیسا سمجھیں ہاں، تو اب فراقؔ کے کچھ اشعار سُنیے :-

یہ نہیں ہوتی تھی حالت جانبِ در دیکھ کر
آستانِ یار سے ہم آج اُٹھ جائیں گے کیا

تجھے تو ہاتھ لگایا ہے بارہا لیکن
ترے خیال کو چھُوتے ہوئے میں ڈرتا ہوں

اپنی ہی گرمی سے آیا عشق میں اک بانکپن
اپنی ہی نرمی سے گھائل ہوگیا حسنِ بُتاں

کرمِ دوست آ گئے تھے یاد — آج میں کچھ اُداس ہوں ہمدم

کچھ نہیں کہتیں وہ نگاہیں مگر — بات پہنچی ہے کہاں سے کہاں

جولاں گہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں منزل نہ کر حدود سے دنیا بنی نہیں

ڈری ڈری سی شبِ تار ختم پر آئی وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اٹھتا ہے کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی امیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی
ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

کہیں دامانِ بادِ صبح بھی آلودہ ہوتا ہے
بچا لیتا ہے حسنِ نرم خو دوشیزگی اپنی

ابھی جبینِ بشر منتظر سی ہو جیسے کہ آدمی ابھی فطرت کا شاہکار نہیں

ابھی ہر شے سے ہوتی ہے نمایاں شانِ انسانی
ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا، کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے — گیا تو وہی خلوصِ سراپا ہے آج بھی

نہ ذکرِ موجِ فنا کر کہ غم کے بیڑوں کو — گدازِ سینۂ ساحل ڈبو چکا کب کا

ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کھول رہی ہے — ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سوتی ہے
دبے پاؤں یہ کس نے آکے خوابِ زندگی بدلا

لطف و ستم و فا جفا یاس و امید و قرب و بعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں

سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں — دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ — کون پیمانہ ہے جو چور نہیں

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا، یہ رات — یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے — اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو   وہ درد اُٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

دیکھ جب عالم یہ ہے حسنِ خمار آلود پر   تجھ لے کو لیتی ہو جیسے کائنات انگڑائیاں

ہوئی ختم صحبتِ میکشی یہی داغ سینوں میں لے چلے
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے کئی آفتابِ خم و سبو

جو تیرے گیسوئے پُرخم سے کھیل بھی نہ سکیں
اُن اُنگلیوں سے ستاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں   وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

ہزار بار زمانہ اِدھر سے گزرا ہے   نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

نظر کے سامنے آئینۂ حیات تو ہے   مری غزل کے نہ معنی ہوں کوئی بات تو ہے

میں نے اِس آواز کو پالا ہے مر مر کے فراقؔ   آج جس کی نرم لَو ہے شمعِ محرابِ حیات

پھر ہیں وہی اُداسیاں، پھر وہی سُونی کائنات　　اہلِ طرب کی محفلیں رنگ جما کے رہ گئیں
مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تری　　مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چرا کے رہ گئیں
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس　　دل کو کئی کہانیاں یاد سی آکے رہ گئیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں

شکوۂ درگذر نما کیوں ہے کہ حسنِ عشق تو سے
اتنا تو سرگراں نہ تھا اتنا تو بدگماں نہ تھا
ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی
کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری

رگِ جاں سے نازک ہیں خط اُس بدن کے　　الٰہی یہ کس کی قلم کاریاں ہیں

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اُسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اُٹھے ہیں چراغ
دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست   سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

جو ہونٹوں تک ترے محدود رہتی ہے ۔ سحر ہوتے
اُفق پر دُور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
کسی کا قامتِ شاداب ہے وہ مصرعِ رنگیں
کہ جس کے سامنے فکرِ غزل شرمائی جاتی ہے
محبت آنکھ جھپکاتی ہے پلکیں غم کی بھاری ہیں
بہت جاگا ہوں اے شامِ فراق اب نیند آتی ہے

آتشِ عشق بھڑکتی ہے ہوا سے پہلے   ہونٹ جلتے ہیں محبت میں دُعا سے پہلے

زندگی کو وفا کی راہوں میں   موت خود روشنی دکھاتی تھی

تمام شبنم و گُل ہے وہ سر سے تابقدم   رُکے رُکے سے کچھ آنسو رُکی رُکی سی ہنسی

بس ایک عشق کے خواب ہونے ہی کی دیر تھی
شباب تھا سنور گیا، زمانہ تھا گزر گیا

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل   وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں
دیکھ رفتارِ انقلاب فراقؔ   کتنی آہستہ اور کتنی تیز

وہ عالم ہوتا ہے مجھ پر جب فکرِ غزل میں کرتا ہوں
خود اپنے خیالوں کو ہمدم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں
افسردہ و تیرہ فضاؤں میں گرمیٔ پرِ جبریل ہوں میں
سوتے سنسار کے سینے میں لے کر آیات اُترتا ہوں

یہ بات بہت کم شعرا کو نصیب ہوئی ہے کہ غزل میں اُن کا نام میرؔ، غالبؔ و آتشؔ کے ساتھ لیا جائے اور نظم میں بھی نظم کے مشاہیر کے ساتھ اُن کا ذکر کیا جائے غزلوں کے شہ کاروں کی تخلیق کرنے سے پہلے کئی معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں جن کی

شادابی اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک اُردو زبان و ادب زندہ ہیں
پہلی چیز جو فراقؔ کی نظموں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں متاثر کرتی ہے وہ اسلوب کی رنگا رنگی اور طرزِ بیان کا تنوع ہے۔ غزل کی طرح نظم میں بھی فراقؔ ایک زبردست موجدِ طرز ہیں۔ اُن کا اپنا ایک رنگ ہے جو ادبیاتِ عالیہ کی یاد ہمیں دلاتا ہے۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ مناظرِ فطرت سے جتنا شدید اثر فراقؔ نے لیا ہے وہ بہت کم شاعروں کے حصے میں آیا ہے۔ اُردو کی منظریہ شاعری میں منظر کے خط و خال کے ساتھ ساتھ اُس کی بھرپور فضا یا اس کی اسپرٹ یا اس کی روح و رواں بہت کم آنے پائی ہے۔ یہ بات یعنی تخلیقِ فضا فراقؔ کی غزلوں اور نظموں میں جگہ جگہ ہمیں ملتی ہے۔ اُردو شاعری کو زمین سے یک گونہ منافرت سی رہی ہے یا صرف سطحی تعلق سا رہا ہے یا کھاؤ پیو مزہ کرو' والی بات رہی ہے۔ فراقؔ نے دھرتی کی شاعری کو جتنا بھرپور بنایا، اُسے جس سکون و استقلال اور فطرت سے جس ہم آہنگی کے ساتھ پیش کیا وہ ہمارے ادب میں قدرِ اوّل کی چیز ہے۔

اربابِ چمن کو کفن خاک اُڑھاتی ۔۔۔ بالیدگی ہر ذرّے میں آتی ہے چھپاتی
تو مرگِ نباتات ہے تو روحِ نباتی ۔۔۔ یا جانِ نمو موجِ فنا بن کے ہے آتی

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل

اے بادِ خزاں چل

پھولے ہوئے گلزار کو ویران کیا ہے　　طاؤس کو اُڑتی ہوئی ناگن نے ڈسا ہے
اک قہر ہے آفت ہے کہ چھلاوہ ہے بلا ہے　　یا باغ میں لہراتی ہوئی برقِ فنا ہے

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں بادِ خزاں چل

اے بادِ خزاں چل

جاں دادۂ ہستیِ پریشانِ چمن تو　　تنہا دمِ تنہائیِ نگہبانِ چمن تو
خلوت کدۂ راز میں مہمانِ چمن تو　　خمیازہ کشِ بادۂ عرفانِ چمن تو

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل

اے بادِ خزاں چل

تو رہزنِ سرمایہ و سامانِ گلستاں　　تو رہبرِ سرِ منزلِ عرفانِ گلستاں
از سمتِ عدم سلسلۂ جنبانِ گلستاں　　جانِ دگرے قالبِ بیجانِ گلستاں

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل

اے بادِ خزاں چل　　(ترانۂ خزاں)

رات بنس دیتی ہے با دیدۂ پُرنم ساقی　　بتیاں خونِ رگِ تاک کی جب جلتی ہیں
جگمگا اُٹھتی ہے تاریکیِ عالم ساقی　　جب چراغوں میں پیالوں کی لَویں ڈھلتی ہیں
تھاپ پر تھاپ پڑی سازِ طرب پر ساقی　　تا بہ کر گنبدِ افلاک لمک جاتی ہے
ساز سے اُٹھتی ہے جھنکار برابر ساقی　　تیرگیِ رات کی رہ رہ کے کھنک جاتی ہے

جولاں گہِ حیات کہیں ختم ہی نہیں　　منزل نہ کہ حدود سے دنیا بنی نہیں

ڈری ڈری سی شبِ تار ختم پر آئی　　وہ پو پھٹی وہ نئی زندگی نظر آئی
کہاں ہر ایک سے بارِ نشاط اُٹھتا ہے　　کہ یہ بلا بھی ترے عاشقوں کے سر آئی
کسی کی بزمِ طرب میں حیات بٹتی تھی　　اُمیدواروں میں کل موت بھی نظر آئی
ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست　　ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

کہیں دامانِ بادِ صبح بھی آلودہ ہوتا ہے
بچا لیتا ہے حسنِ نرم خود دوشیزگی اپنی

ابھی جبینِ بشر منتظر سی ہو جیسے　　کہ آدمی ابھی فطرت کا شاہکار نہیں

ابھی ہر شے سے ہوتی ہے نمایاں شانِ انسانی
ابھی ہر چیز میں محسوس ہوتی ہے کمی اپنی

کچھ قفس کی تیلیوں سے چھن رہا ہے نور سا
کچھ فضا، کچھ حسرتِ پرواز کی باتیں کرو

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے — کیا تو وہی خلوصِ سراپا ہے آج بھی

نہ ذکرِ موجِ فنا کر کہ غم کے بیڑوں کو — گدازِ سینۂ ساحل ڈبو چکا کب کا

ہر عقدۂ تقدیرِ جہاں کھول رہی ہے — ہاں دھیان سے سننا یہ صدی بول رہی ہے

ستارے جاگتے ہیں رات لٹ چھٹکائے سوتی ہے
دبے پاؤں یہ کس نے آ کے خوابِ زندگی بدلا

لطف و ستم و فا جفا یاس و امید و قرب و بعد
عشق کی عمر کٹ گئی چند توہمات میں

سنگ و آہن بے نیازِ غم نہیں — دیکھ ہر دیوار و در سے سر نہ مار

خستگی مہر و ماہ کی مت پوچھ — کون پیمانہ ہے جو چُور نہیں

یہ نکہتوں کی نرم روی، یہ ہوا، یہ رات — یاد آ رہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے — اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

تھی یوں تو شامِ ہجر مگر پچھلی رات کو وہ درد اُٹھا فراقؔ کہ میں مسکرا دیا

دیکھ جب عالم یہ ہے حسنِ خمار آلود پر تیِ پچھلے کو لیتی ہو جیسے کائنات انگڑائیاں

ہوئی ختم صحبتِ میکشی یہی داغ سینوں میں لے چلے
کہ طلوع ہونے سے رہ گئے کئی آفتاب خُمِ دسبو

جو تیرے گیسوئے پُرخم سے کھیل بھی نہ سکیں
اُن اُنگلیوں سے ستاروں کو چھیڑ سکتا ہوں

منزلیں گرد کی مانند اُڑی جاتی ہیں وہی اندازِ جہانِ گزراں ہے کہ جو تھا

ہزار بار زمانہ ادھر سے گزرا ہے نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگزر پھر بھی

نظر کے سامنے آئینۂ حیات تو ہے مری غزل کے نہ معنی ہوں کوئی بات تو ہے

میں نے اِس آواز کو پالا ہے مر مر کے فراقؔ آج جس کی نرم لَو ہے شمعِ محرابِ حیات

پھر ہیں وہی اُداسیاں، پھر وہی سُونی کائنات — اہلِ طرب کی محفلیں رنگ جما کے رہ گئیں
مجھ کو خراب کر گئیں نیم نگاہیاں تری — مجھ سے حیات و موت بھی آنکھیں چرا کے رہ گئیں
شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس — دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں
مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بیجا بھی نہیں

شکوۂ رہگذر نما کیوں ہے کہ حسنِ عشق سے
اتنا تو سرگراں نہ تھا اتنا تو بدگماں نہ تھا
ایک کو ایک کی خبر منزلِ عشق میں نہ تھی
کوئی بھی اہلِ کارواں شاملِ کارواں نہ تھا

جب جب اسے سوچا ہے دل تھام لیا میں نے
انسان کے ہاتھوں سے انسان پہ جو گزری

رگِ جاں سے نازک ہیں خط اُس بدن کے — الٰہی یہ کس کی قلم کاریاں ہیں

یہ نرم نرم ہوا جھلملا رہے ہیں چراغ
ترے خیال کی خوشبو سے بس رہے ہیں دماغ
جو چھپ کے تاروں کی آنکھوں سے پاؤں دھرتا ہے
اُسی کے نقشِ کفِ پا سے جل اُٹھے ہیں چراغ
دلوں میں داغِ محبت کا اب یہ عالم ہے
کہ جیسے نیند میں ڈوبے ہوں پچھلی رات چراغ

زندگی کیا ہے اس کو آج اے دوست　　سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

جو ہونٹوں تک ترے محدود رہتی ہے۔ سحر ہوتے
اُفق پر دُور تک وہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے
کسی کا قامتِ شاداب ہے وہ مصرعِ رنگیں
کہ جس کے سامنے فکرِ غزل شرمائی جاتی ہے
محبت آنکھ جھپکاتی ہے پلکیں غم کی بھاری ہیں
بہت جاگا ہوں اے شامِ فراق اب نیند آتی ہے

آتشِ عشق بھڑکتی ہے ہوا سے پہلے　　ہونٹ جلتے ہیں محبت میں دعا سے پہلے

زندگی کو وفا کی راہوں میں　　موت خود روشنی دکھاتی تھی

تمام شبنم و گُل ہے وہ سر سے تا بقدم　　رُکے رُکے سے کچھ آنسو کی رُکی سی ہنسی

بس ایک عشق کے خراب ہونے ہی کی دیر تھی
شباب تھا سنور گیا، زمانہ تھا گزر گیا

زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل　　وہ رات ہے کوئی ذرہ بھی محوِ خواب نہیں
دیکھ رفتارِ انقلاب فراق　　کتنی آہستہ اور کتنی تیز

وہ عالم ہوتا ہے مجھ پر جب فکرِ غزل میں کرتا ہوں
خود اپنے خیالوں کو ہمدم میں ہاتھ لگاتے ڈرتا ہوں
افسردہ و تیرہ فضاؤں میں گرمیٔ پرِ جبریل ہوں میں
سوتے سنسار کے سینے میں لے کر آیات اُترتا ہوں

یہ بات بہت کم شعرا کو نصیب ہوئی ہے کہ غزل میں اُن کا نام میرؔ، غالبؔ
و آتشؔ کے ساتھ لیا جائے اور نظم میں بھی نظم کے مشاہیر کے ساتھ اُن کا ذکر کیا جائے
غزلوں کے شہ کاروں کی تخلیق کرنے سے پہلے کئی معرکۃ الآرا نظمیں لکھیں جن کی

شادابی اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک اُردو زبان وادب زندہ ہیں
پہلی چیز جو فراق کی نظموں پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں متاثر کرتی ہے وہ اسلوب
کی رنگارنگی اور طرزِ بیان کا تنوع ہے۔ غزل کی طرح نظم میں بھی فراق ایک
زبردست موجدِ طرز ہیں۔ اُن کا اپنا ایک رنگ ہے جو ادبیاتِ عالیہ کی یاد ہیں
دلاتا ہے۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ مناظرِ فطرت سے جتنا شدید اثر فراق نے
لیا ہے وہ بہت کم شاعروں کے حصّے میں آیا ہے۔ اُردو کی منظریہ شاعری
میں منظر کے خدوخال کے ساتھ ساتھ اُس کی بھرپور فضا یا اس کی اسپرٹ
یا اس کی روح و رواں بہت کم آنے پائی ہے۔ یہ بات یعنی تخلیقِ فضا فراق
کی غزلوں اور نظموں میں جگہ جگہ ہمیں ملتی ہے۔ اُردو شاعری کو زمین سے یک گونہ
منافرت سی رہی ہے یا صرف سطحی تعلق سا رہا ہے یا کھاؤ پیو مزہ کرو' والی
بات رہی ہے۔ فراق نے دھرتی کی شاعری کو جتنا بھرپور بنایا، اُسے جس
سکون و استقلال اور فطرت سے جس ہم آہنگی کے ساتھ پیش کیا وہ ہمارے
ادب میں قدرِ اوّل کی چیز ہے۔

ارباب چمن کو کفن خاک اُڑھاتی | بالیدگی ہر ذرّے میں آتی ہے چھپاتی
تو مرگِ نبا آت ہے تو روحِ نباتی | یا جانِ نمو موجِ فنا بن کے ہے آتی

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

پھولے ہوئے گلزار کو ویران کیا ہے   طاؤس کو اُڑتی ہوئی ناگن نے ڈسا ہے
اک قہر ہے آفت ہے چھلاوہ ہے بلا ہے   یا باغ میں لہراتی ہوئی برقِ فنا ہے

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

جاں دادۂ ہستی پریشانِ چمن تو   تنہا دمِ تنہائی نگہبانِ چمن تو
خلوت کدۂ راز میں مہمانِ چمن تو   خمیازہ کشِ بادۂ عرفانِ چمن تو

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل

تو رہزنِ سرمایہ و سامانِ گلستاں   تو رہبرِ سرمنزلِ عرفانِ گلستاں
از سمتِ عدم سلسلہ جنبانِ گلستاں   جانِ دگرے قالبِ بیجانِ گلستاں

اے بادِ خزاں، بادِ خزاں، بادِ خزاں چل
اے بادِ خزاں چل   (ترانۂ خزاں)

رات نبض دیتی ہے بادیدۂ پُرنم ساقی   بتیاں خونِ رگِ تاک کی جب جلتی ہیں
جگمگا اُٹھتی ہے تاریکیٔ عالم ساقی   جب چراغوں میں پیالوں کی لَویں ڈھلتی ہیں
تھاپ پر تھاپ پڑی سازِ طرب پر ساقی   تا بہ گنبدِ افلاک کمک جاتی ہے
ساز سے اُٹھتی ہے جھنکار برابر ساقی   تیرگی رات کی رہ رہ کے کھنک جاتی ہے

پھول گرتے ہیں سرِ فرش برابر ساقی
ساز کی آنچ پہ رقصندہ شراروں کا گماں

گرمیٔ رقص سے دہکے ہوئے پیکرِ ساقی
وہ پسینے کی جھلک دیتی ہوئی کاہکشاں

جام اُچھلتے ہیں لویں دیتی ہیں سرشار فضائیں
شعلے سنگیت کے سانچے میں یہاں ڈھلتے ہیں

آنکھیں جھپکاتی ہیں رہ رہ کے غم آلود ہوائیں
رقص کی شوخ اداؤں سے کنول جلتے ہیں

گت میں اندازِ جہانِ گزراں ہے ساقی
سُر کے پردوں سے کوئی دردِ نہاں اُٹھتا ہے

(رقصِ شب تاب)

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھر آئے

وہ سوز جو تاریکیوں میں شمع جلائے
وہ ساز جو سوئی ہوئی یادوں کو جگائے

آنکھوں کو پر اک شاہدِ رعنا نظر آئے
"زرّیں کمرے کج کلہے تنگ قبائے"

پلکوں کے تلے میکدۂ راز کے جلوے
ظلمت میں گناہوں کے چراغوں کو جلائے

اک برقِ ادا، شعلہ قبا پیکرِ رنگیں
دامانِ مہ و مہر کو پہلو میں دبائے

کوندا ہو گداز اُف یہ تبسم کی گھلاوٹ
لہجے کی کھنک لَو جو ستاروں سے چرائے

لَو دیتا ہوا صبحِ بہاراں کا ترنّم
وہ نرم صباحت جو رچی بھیرویں گائے

وہ نرم کلامی کہ سکوت آنکھ اُٹھائے
آہستہ خرامی کی فضا وجد میں آئے

وہ شوخیٔ محتاط کے بچتے ہوئے انداز
دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھائے

کیوں تیرے غمِ ہجر میں دن ڈوب چلا ہے
کیوں یاد تری آتے ہی تارے نکل آئے

برسات کی اس رات میں اے دوست تری یاد
اک تیز چھُری ہے جو اُترتی چلی جائے

کچھ ایسی بھی گزری ہیں ترے ہجر میں راتیں   دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

شاعر ہیں فراقؔ آپ بڑے پائے کے لیکن
رکھا ہے عجب نام کہ جو راس نہ آئے

(بزم برشگال)

ترے کلام میں تھی گدگدی بھی آنسو بھی
کبھی وطن کو ہنسایا کبھی اُداس کیا
سخن کے ساز میں وہ درد بھر دیا تونے
وطن کو اپنے ترانوں سے خود شناس کیا

چراغِ راہ نہ کوئی، نہ کوئی بانگِ جرس   ہمیں خبر ہی نہ تھی ہم کہاں تھے اے اکبرؔ
کچھ ایسا وقت پڑا تھا کہ چند اکابرِ ہند   وطن کو بیچ دیں جب وطن کے پردے میں
ترا ہی کام تھا افشائے راز کر دینا   دلوں کا چور نکالا سخن کے پردے میں

میں سوچتا ہوں کہاں وہ سیاسی نعروں میں   جو تازیانۂ ہمت تری لتاڑ میں ہے
کہاں وہ تلخ کلامی میں شیخ و واعظ کی   جو تیز نشتریت تیری چھیڑ چھاڑ میں ہے

میں سوچتا ہوں کہاں بجلیوں کی چشمک میں　　　جو ایک راز تری شوخیٔ نگاہ میں ہے
میں پوچھتا ہوں کہاں منطقی دلائل میں　　　جو ایک بات ترے طرزِ بے پناہ میں ہے

تری شگفتہ نوائی کی وہ بہارِ سخن　　　کہ شعر شعر میں کھلتا ہوا گلستاں تھا
کچھ آنکھ والے ہی اُس کو پرکھ سکے لیکن　　　پسِ مزاح جو اشکوں کا شبستاں تھا

ہماری نیند نے مُردوں سے شرط باندھی تھی　　　حیاتِ ہند کے ماتھے پہ موت کا تھا کلنک
وہ تیز ٹیس اُٹھی آنکھ کھل گئی جو لگا　　　ترے تبسّمِ زیرِ لبی کا تیکھا ڈنک

نئی زمین نیا آسماں نئی دنیا　　　نئی ہے محفلِ ساقی نئے ہیں جام و سبو
یہ سب سہی مگر اے جُرعہ نوشِ بادۂ ہند　　　ہنسا رُلا کے ہمیں دے گیا بہت کچھ تُو

(اکبر الہ آبادی)

ہوں میں ہی صبر پانچوں پانڈوؤں کا دشت گردی میں
میں جانبازی ہوں جنگِ بدر میں سر کھونے والوں کی
ہوں استقلال میں ہی رام کا صحرا نوردی میں
ہوں گہری نیند خاکِ کربلا میں سونے والوں کی

میں ہوں مظلوم کی فریاد ظالم کی ستم کوشی
ہوں زرِ منعم کا مفلس کا غم فاقہ کشی میں ہوں
میں ہوں زاہد کا پرہیز اور رندوں کی بلانوشی
حلیموں میں ہوں حلم اور سرکشوں کی سرکشی میں ہوں

شفق میں ہوں میں سُرخیِ چشمِ انجم میں ہوں بیداری
شعاعِ مہرِ عالم تاب میں میں تھرتھراہٹ ہوں
میں ہوں پچھلے پہر مے خانہ عالم کی سرشاری
طلوعِ صبح میں مَیں ہی فضا کی کپکپاہٹ ہوں
(روحِ کائنات)

فراقؔ کی شاعری اندازاً بیس بہاریں دیکھ چکی تھی جب اُس میں سیاسی شعور رونما ہونے لگا۔ دھرتی کی شاعری کے ساتھ ساتھ داستانِ آدم بھی فراقؔ کی شاعری میں سنائی دینے لگی۔ فراقؔ کا سیاسی شعور چکبست کا سیاسی شعور نہیں ہے اور نہ وہ حالیؔ، اکبرؔ یا اقبالؔ کا سیاسی شعور ہے۔ یہ سیاسی شعور فلسفۂ اشتراکیت سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی وسعتیں اور گہرائیاں، اس کی تہیں اور معنویتیں، اس کے لوازمات اور نتائج، دوسرے سیاسی نظریوں سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے میں فراقؔ کے اندر یہ سیاسی شعور اُبھرنا شروع ہوتا ہے

اور اب تک اُبھرتا چلا جا رہا ہے۔ فراؔق کی اشتراکی نظموں میں بہت نازک اور بلیغ اشاریت ہے اور ہندوستان کے اس دورِ زندگی کے شعوری اور تحت الشعوری ترقی پسند رجحانات کی غیر معمولی کشافی اور آئینہ داری ان نظموں میں ملتی ہے۔ جستہ جستہ کچھ نمونے پیش کرتا ہوں :۔

ہمیں سے ملّتیں اُبھریں ہمیں سے انقلاب آئے — زمیں کی منزلیں ہیں گردشِ ہفت آسماں ہم ہیں
ازل سے چشمِ انجم منتظر تھی جس کی دنیا ہیں — اُسی بیداریٔ نوعِ بشر کی داستاں ہم ہیں
ہمیں پر اب نگاہِ مضطرب اُٹھتی ہے عالم کی — کہ اس بےچین دنیا کے لیے دارالاماں ہم ہیں
فراؔق اکثر اُڑایا تار تار رونیک و بد جس نے — وہی شوریدہ سر وارفتہ دل آشفتہ جاں ہم ہیں

(کاروانِ انقلاب)

کانوں میں زلزلوں کی دھمک آ رہی ہے آج — ہر چیز کائنات کی تھرّا رہی ہے آج
ہر لفظ کے معانی و مطلب بدل چلے — ہر بات اور بات ہوئی جا رہی ہے آج
ہر ذرّہ آج آئینۂ انقلاب ہے — ہر چیز اور چیز ہوئی جا رہی ہے آج
ابنائے دہر لیتے ہیں یوں سانس گرم تیز — جینے میں جیسے دیر ہوئی جا رہی ہے آج
بیتے جگوں کی چھاؤں ہے امروز پر فراؔق — ہر چیز اک فسانہ ہوئی جا رہی ہے آج

(تاریخ اپنے آپ کو....)

دے رہا ہے عہدِ رفتہ آج بھی اپنا نشاں — آج بھی خاکسترِ ماضی سے اُٹھتا ہے دھواں
اب گزرتا ہے وہاں سے زندگی کا کارواں — موت کی بھی جن فضاؤں میں نکل آئے زباں

آج دو جگ مل رہے ہیں کاٹتی ہیں پے بہ پے — پاس کی پرچھائیوں کو دور کی پرچھائیاں
دیکھئے لو دیتا جائے کب تک آدم کا گناہ — دیکھئے اُٹھتا ہے کب تک خرمنِ انساں سے دھواں
پڑ رہے ہیں دور تک سینوں میں زنگار رنگ عکس — سج رہی ہے آئینہ در آئینہ بزمِ جہاں
نغمۂ شاعر سے مرجھائے گلستاں لہلہائے — کرتی ہے امرت کی برکھا آج شعلے کی زباں
نیند مُردوں کی اُچٹ جاتی ہے جس آواز سے — پھر اُسی سُر میں ہیں ہیں اے سازِ فطرت نوحہ خواں
دیکھتی ہے بعد مدت آج پھر انسانیت — خوابِ مستقل جھپک جاتی ہیں جن سے بجلیاں

اپنے جھنڈے گاڑ دے انسانیت اس موڑ پر
آئی وہ منزل نہیں ہے موت بھی اب درمیاں

(آثارِ انقلاب)

اِن اقتباسات سے اُس بلیغ اشاریت کا اندازہ ہوتا ہے اور اُس نازک ترجمانی کا بھی جو فراق کی ان سیاسی نظموں کو ادبیاتِ عالیہ کی مثالیں بنا دیتے ہیں۔ فراق کی ایک نظم کا عنوان ہے "روٹیاں" جس کا موضوع یا مبحث اتنا پیچیدہ ہے کہ اُسے ہاتھ لگاتے قادر الکلام ترقی پسند شعرا بھی ہچکچاتے۔ اس نظم میں فراق نے ایک بہت مشکل بحث اُٹھائی ہے۔ کئی سمتوں سے اشتراکیت کے مخالف یہ آواز اُٹھاتے رہے ہیں کہ مادہ پرستی اور دہریت مارکس کے فلسفۂ اشتراکیت کے بنیادی اُصول ہیں۔ اشتراکیت روٹیاں سب کے لیے ممکن ہے فراہم کر دے لیکن انسان جانور نہیں ہے جو صرف پیٹ بھرنے سے آسودہ

ہو جائے۔ اخلاقیات، جمالیات، تہذیب کی روحانی قدریں اور زندگی کی دوسری لطافتیں اشتراکیت کے بس کی چیزیں نہیں۔ اس نظم میں فراق نے نہایت دلآویز اور مدلل انداز میں یہ بتایا ہے کہ دُنیا کی ایک تہائی آبادی جو آج اشتراکیت کے جھنڈے کے نیچے ہے اور جس کی تعداد اتنی کروڑ ہے' اپنے اندر سو فیصدی انسانوں کا سب دُکھ درد دُور کر کے سب کو خوش حال بنا کر زندگی کو ترقی کی راہ پر جس طرح گامزن کروا ہے کیا یہ معجزہ دنیا میں پہلے کبھی ہوا تھا اور یہ کارِعظیم علوم' اخلاقیات، بلند اور نازک تجربوں غیر معمولی قوت ارادی کے بغیر ممکن ہے؟ اس نظم میں روٹیاں کا لفظ ایک علامتی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔ تمام خارجی و داخلی بھرپور ترقیوں کے لیے چند بند سنئے:۔

تو کہتا ہے روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے　　اٹل تیرا روحانیت پر یقیں ہے
وہاں آتم سدھی دھرم ہے نہ دیں ہے　　رشا ہین میں نورِ عرفاں کہیں ہے

تو کہتا ہے واں آدمیت نہیں ہے　　محبت نہیں ہے شرافت نہیں ہے
وہاں زندگی کی لطافت نہیں ہے　　وہاں چیزوں کی قدر و قیمت نہیں ہے

نہ اسے علے خیالی نہ شانِ جمالی　　نہ وجدانیت نے حقیقت شناسی
کمی ہے وہاں آج روحانیت کی　　وہاں کچھ اگر ہے تو روٹی ہی روٹی

یہی چین اور روس ہے بات کل کی کہتے وہ دیس شرماتے جن سے کبھی
نہ عزت نہ دولت نہ کپڑا نہ روٹی نہ علم اور حکمت نہ دیا نہ بتی

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

اُدھر زندگی خاک و خوں میں نہاتی اُدھر منہ پہ بھنکتیں مکھیاں بھنبھناتی
یہاں زیست ٹھوکر پہ ٹھوکر بھی کھاتی نہ جیتے بن آتی نہ مرتے بن آتی

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

یہ تھی بھکشکوں پادریوں کی دنیا یہ تھی بے بسوں بھوکے ننگوں کی دنیا
نشے بازوں افیونچیوں کی دنیا جہالت فلاکت کے ماروں کی دنیا

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

تو ان انقلابوں کا مطلب بھی سمجھا جنھوں نے وہاں کی پلٹ دی ہے کایا
جنھوں نے وہاں رُخ زمانے کا بدلا پلک مارتے پاپ خیموں کا بدلا

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

وہاں زندگی آج روتی نہیں ہے وہاں آج تقدیر سوتی نہیں ہے
وہاں موت کی جیت ہوتی نہیں ہے حیات اپنا منہ خوں سے دھوتی نہیں ہے

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

چمن زار بنجر زمیں کو بنانا کروروں بگھے کھیتیاں لہلہانا
جہاں موت اُگے زندگی واں اُگانا تو سوچے تو وجدان کا ہے خزانہ

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

وہاں تیرتھ و حج ہے کھیتوں میں جانا طوافِ حرم ٹریکٹر کا چلانا
ہے مکہ مدینہ ہر اک کارخانہ پسینے میں تر ہونا گنگا نہانا

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

دلوں میں وہاں دردِ انسانیت ہے خیالات میں شانِ وجدانیت ہے
ہتھوڑے میں ہنسیے میں عرفانیت ہے وہاں ہر عمل عین روحانیت ہے

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

سنہری کھڑی کھیتیوں سے محبت پہاڑوں سے اور وادیوں سے محبت
جوانوں کی سرگرمیوں سے محبت وہ بچّوں کی معصومیوں سے محبت

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

کئی کام وہ جو سمجھ میں نہ آتے لگیں مدتیں سیکھتے اور سکھاتے
زمانہ گذر جائے جن کو بناتے اُنھیں کر دکھایا ہے چٹکی بجاتے

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

'روٹیاں' اندازاً سو بندوں کی نظم ہے۔ جہاں آگے چل کر ہندوستان کا ذکر آیا ہے وہاں غیر معمولی قدرتِ بیان کا ثبوت فراقؔ نے دیا ہے۔ مسدسِ حالؔی میں بیان کی جو نرم اور بے تکلف روانی ہے اُس کا دوسرا نمونہ ہماری شاعری

میں فراق کی یہ نظم ہے۔ دو او ربند سنا کر اس سلسلے کو ختم کرتا ہوں۔

ہم انساں کو دُنیا میں رونے نہ دیں گے　　بلکہ کر اُسے جان کھونے نہ دیں گے
تمدن کا بیڑا ڈبونے نہ دیں گے　　ہم اب تیسری جنگ ہونے نہ دیں گے

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

زمانہ یہ ہر کیرتن کا نہیں ہے　　کہ یہ زندگی راس لیلا نہیں ہے
مقدر بدلنا تماشا نہیں ہے　　کتھا ست نراین کی دُنیا نہیں ہے

یہ مانا کہ روٹی ہی سب کچھ نہیں ہے

اس پوری نظم کا ترجمہ نیپالی زبان میں ہو چکا ہے اور وہاں اسے گھر گھر بچے گاتے ہیں۔ ہندی میں بھی یہ اردو ہی کی طرح مقبول ہوئی ہے۔ دھرتی کی کروٹ فراق کی وہ نظم ہے جو ترقی پسند شاعری کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ محنت کش پیشے کی عظمت اس پُرشکوہ انداز اور اتنی سہل زبان میں شاید ہی کسی زبان میں پیش کی گئی ہو۔ طوالت کے خوف سے صرف چار بند پیش کرتا ہوں۔ نظم میں دو سو بند ہیں۔

چاند اور سورج کی کرنوں سے　　چادر بُن کر رکھ دیتے ہیں
اِسی ہتھوڑے کی ضربوں سے　　لوہا دُھن کر رکھ دیتے ہیں

جان ڈال دی تصویروں میں　　یوں ہر خط چمکایا ہم نے
گونجے اُٹھتے ہیں وہ نقطے　　چوم لیا ہے جن کو قلم نے

ان ہاتھوں کی گلکاری میں — صبح بہار سانس لیتی ہے
ہم نے دبا دی ہیں وہ آنچیں — مٹی کو پر لو دیتی ہے

ہاتھ ہمارا ہی گھر گھر میں — لے کے چراغ شام آیا ہے
بنیادوں سے ردا ردا — خون ہمارا کام آیا ہے

اس زمانے میں مشینوں کے کارخانے مزدوروں کے گویا ہم پیشہ ہو چکے ہیں۔ بیسویں صدی کے مزدور کی عظمت ان بندوں میں دیکھئے:۔

گھن گھن گھن ان گنت مشینوں — کے پہیوں کا چکر کھانا
یہ گھڑ گھڑ گھڑ یہ زیر و بم — سیاروں کا تال کر گانا

یہ مشین کی گڑگڑاہٹیں — دھرتی کی چھاتی ہل جائے
دھواں چمنیوں سے اٹھتا ہے — گگن پر جیسے ناگ لہرائے

ندیوں کا منہ موڑ دیا ہے — ویرانہ لہراتا ہے
ریگستانوں میں اب پانی — گگن کھیلتا جاتا ہے

فراقؔ کی غزلوں، رومانی رباعیوں اور نظموں میں بیان کی لطافت اور رنگینی اسی مضمون میں آپ نے دیکھ لی ہوں گی۔ کیا خواب میں بھی یہ تصور ممکن

تھا کہ عشقیہ اور جمالیاتی شاعری کا یہ فن کار ایسے بند بھی لکھ سکتا ہے جو آپ نے دیکھے ۔ اتنے مختلف اسلوبوں اور اتنی مختلف شعری کائناتوں کی تخلیق کو ایک دل و دماغ سے منسوب کرتے ہوئے ہم حیرت میں پڑ جاتے ہیں ۔ عوامی شاعری کے دو نمونے فراق نے 'امریکی بنجارہ نامہ' اور 'ٹوالر دیس' کے عنوان سے دو نظموں میں پیش کیے ہیں :۔

ہٹلر مسولینی ٹوجو کا جو حشر ہوا وہ دیکھ لیا
انگلینڈ میں ہو یا فرانس میں ہو مغرب ہو کہ مشرق کا خطّہ
اب اُونچے سُروں میں سرمائے کا راگ سنائی نہیں دیتا
اس ساز پہ ایسی چوٹ پڑی جس سے پھٹ جائے ہر پردا
پونجی کا پیانو ٹوٹ چکا اب ہاتھ میں لے لے اکتارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

وہ دیکھ کے اب دنیا بھر میں مزدوروں کے دل سجتے ہیں
وہ سُن کہ تنے مظلوم کہیں شیروں کی طرح گرجتے ہیں
غصّے سے وہ چہرے دمکتے ہیں شعلوں سے وہ سینے منجتے ہیں
وہ باغیوں کے لشکر میں کہیں اب کوچ کے ڈنکے بجتے ہیں
وہ اُڑے شرر وہ انقلاب کے کالے ناگ نے پھنکارا
سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا (امریکی بنجارہ نامہ)

"ڈالر دیس" کے دو بند سنئیے :۔

وہ وال اسٹریٹ کا قشقا خانہ، وہائٹ ہاؤس کا سازش گھر
وہ دلّالی کے داؤ پیچ، وہ ڈپلومیسی کے چھومنتر
وہ لوٹا لوٹ تجارت میں، وہ جنتا راج کا آڈمبر
وہ لین دین میں کھینچا تانی، راج نیت میں اگر مگر
ہم ڈالر دیس کو دیکھ آئے

اِس وال اسٹریٹ میں دنیا کا دیوالہ بولا جاتا ہے
جو لٹوائے، جو بکوائے، وہ کھاتہ کھولا جاتا ہے
اس وہائٹ ہاؤس میں سب کی دُکھتی رگ کو ٹٹولا جاتا ہے
سرکاروں، ملکوں، قوموں کو کانٹوں میں تولا جاتا ہے
ہم ڈالر دیس کو دیکھ آئے

"داستانِ آدم" فراق کی وہ نظم ہے جس میں بے سروسامان و بے بس وحشی انسان کے زمانے سے دورِ اشتراکیت یا نئے زمانے تک کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔ اس نظم کا انداز بیان سحر کارانہ ہے۔ کچھ بند سنئیے :۔

قرنوں کے مٹانے سے مٹے ہیں نہ مٹیں گے — آفاتِ زمانہ سے جھکے ہیں نہ جھکیں گے
اُبھرے تو دبانے سے دبے ہیں نہ دبیں گے — ہم موت کے مارے بھی مرے ہیں نہ مریں گے
ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

تاریخ و تمدن سے بہت پہلے کے ادوار   بے تیغ و سپر موت سے وہ جنگ و پیکار
وہ غولِ بیاباں وہ بہائم کئی خونخوار   ایسے میں جیتے ہیں تو کبھی ہم نہ مریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جو شاخ لچکتی ہے کڑکتی سی کماں ہے   جو چیز چمک جاتی ہے اک نوکِ سناں ہے
ایک ایک کرن تاروں کی ناگن کی زباں ہے   ہر لحظہ یہی خوف کہ اب کے نہ بچیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جب دشت نوردی کے منازل سے بڑھ آئے   گر خانہ بدوشی کو زراعت کے سکھائے
پُرامن سکونت کے لیے گاؤں بسائے   کل اپنے ہی قدموں کے تلے شہر اُگیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

کھیتوں کو اُگاتے گئے اُگتے گئے خود بھی   فصلوں کو اُبھارا تو اُبھرتے گئے خود بھی
فطرت کو نکھارا تو نکھرتے گئے خود بھی   رنت اپنے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جب مصر کی تہذیب پہ منڈلائے گی ظلمت   ساتھ اپنے چلی جائے گی اہرام کی حرمت
ہم ابنِ براہیم بصد کلفت و حسرت   جب نیل کی وادی کی زمیں چھوڑ چلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

دنیا میں ہیں کنگال بھی اور اہلِ دُول بھی   ہے تاک میں دونوں ہی کے صیادِ اجل بھی
دنیا کا ہے یہ رنگ تو کیا راج محل بھی   راتوں کو کپل وستو سے منہ موڑ چلیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

یونان کی مٹتی ہوئی عظمت کا زمانہ　　کچھ روز وں میں ہو جائیگا ایک خوابِ شبانہ
جب موت کا وہ ڈھونڈ رہی ہوگی بہانہ　　ایتھنس کے زنداں میں ہم زہر پئیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

جب روم کی تہذیب زمانے میں تپے گی　　جب سینۂ جمہور میں اک آگ لگے گی
جب دیکھیں گے اس آگ سے دنیا نہ بچے گی　　کوہوں سے پکاریں گے صلیبوں پہ چڑھیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

پلٹیں گے عرب میں بھی تمدن کے قرینے　　سُن کر نئی آواز دھڑکتے ہوئے سینے
تاب اس کی نہ لائیں گے تو مکے سے مدینے　　اک مصلحتِ وقت سے ہجرت بھی کریں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

آندھی کی طرح اُٹھیں گے ساسانی و تاتار　　تو گھوڑوں کی ٹاپوں سے اڑا دیں گے کہسار
لگ جائیں گے ہر چار طرف لاشوں کے انبار　　سو رنگ سے ہم قاتل و مقتول بنیں گے

ہم زندہ تھے ہم زندہ ہیں ہم زندہ رہیں گے

اب میں آپ کو اسلوبِ بیان، منظر نگاری، نظمِ معرّیٰ کی ایک نئی تکنیک، تخلیقِ فضا کی ایک دوسری دنیا میں لے چلتا ہوں 'آدھی رات' کے عنوان سے فراقؔ کی نظمِ معرّیٰ ایک لافانی شاہکار ہے جو نئی شاعری کی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نظم کی صوتیات بلند ترین انگریزی بلینک ورس

کی یاد دلاتی ہے۔ جمالیاتی شعور کا یہ ٹھہراؤ اُردو ادب میں ہمیں کہیں اور نہیں ملتا۔

سیاہ پیڑ ہیں اب آپ اپنی پرچھائیں
جدھر نگاہ کریں ایک سکونِ بے پایاں
زمین سے تا مہ و انجم سکوت کے مینار
جھلک رہا ہے پڑا چاندنی کے درپن میں
رسیلے کیف بھرے منظروں کا جاگتا خواب
اک ایک کر کے نند اسے چراغوں کی پلکیں
جھپک گئیں جو کھلی ہیں جھپکنے والی ہیں
فلک پہ تاروں کو پہلی جماہیاں آئیں

تمولیوں کی دُکانیں کہیں کہیں ہیں کھُلی
کچھ اونگھتی ہوئی بڑھتی ہیں شاہراہوں پر
سواریوں کے بڑے گھنگھروؤں کی جھنکاریں
کھڑا ہے اوس میں چُپ چاپ ہر سنگار کا پیڑ
دُلہن ہو جیسے حیا کی سگندھ سے بوجھل
یہ موجِ نور یہ بھرپور یہ کھلی ہوئی رات
کہ جیسے کھلتا چلا جائے اک سفید کنول

ہوائیں نیند کے کھیتوں سے جیسے آتی ہوں
سیاہ روس ہیں اب کتنی دُور برلن سے؟
چھلک رہی ہے خُمِ غیب سے شرابِ وجود
فضائے دہر ہے اک نرگسِ خمار آلود
جگا رہا ہے کوئی آدھی رات کا جادو
کنول کی چٹکیوں میں لے لیا ندی کا سہاگ

یہ سانس لیتی ہوئی کائنات یہ شبِ ماہ
یہ پُرسکون اُداسی یہ بھیگی بھیگی فضا
ستارے ہیں کہ جہاں پر ہے آنسوؤں کا کفن
زمانہ کتنا لڑائی کو رہ گیا ہوگا
مرے خیال سے اب ایک بج رہا ہوگا

یہ نظم اب سے ۹ سال پہلے فراقؔ نے کہی تھی۔ اُردو بلینک ورس نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد آج تک اس سطح کو چھو سکی۔

آخر میں فراقؔ کی غالباً سب سے معرکہ آرا نظم 'انقلابِ چین' سے کچھ اقتباسات پیش کر رہا ہوں۔ 'انقلابِ چین' میں ۵۲ مسلسل رباعیاں ہیں۔ فراقؔ کی رباعیوں کا ذکر آگے آئے گا۔ یہاں صرف اتنا کہوں گا کہ انقلاب کی روح در دل

اس کے گہرے داخلی اُصول، اس کے نتائج اور زندگی پہ اُس کا گہرا اثر جس انداز سے ان رباعیوں میں پیش کیا گیا ہے، وہ دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ فراق کی رباعیوں کی صوتیات، آواز کا بھرپور پن اور وزن یہ سب خاص توجہ کی مستحق ہیں۔ اُردو زبان کے لہجے میں یہ سنجیدگی و شائستگی اور یہ ترنّم ایک نہایت بلند اور خوشگوار اضافے ہیں:-

منڈلائی کئی کروڑ ہاتھوں کی گھٹا	گلزار کئی کروڑ چہروں کا کھلا
جل اُٹھے کئی کروڑ سینوں میں چراغ	پردہ سا کئی کروڑ آنکھوں سے اُٹھا

وہ کشتِ بہارِ عصر لہکی لہکی	کھیتوں کی سہانی سانس مہکی مہکی
سازِ امروز میں وہ سوزِ فردا	وہ آتشِ انقلاب دہکی دہکی

یہ ولولہ یہ اُمنگ دریا دریا	یہ شعلۂ بے درنگ صحرا صحرا
یہ پرتوِ انقلاب عالم عالم	یہ جلوۂ انقلاب دُنیا دُنیا

دشت و گلزار کوہ و دریا آزاد	گوشہ گوشہ و خِطّہ خِطّہ آزاد
میخانہ و بزم و جام مینا آزاد	دورِ مہ و سال و لمحہ لمحہ آزاد

ہاتھوں میں عنانِ وقت لینے والے   بڑھے تاریخ نو کے کھینے والے
صف اندر صف اُبھرے ہیں قلعہ شکن   روئی سے پہاڑ توڑ دینے والے

آپس میں نئے قول و قسم لیتے ہیں   پھر جائزہ ہائے کیف و کم لیتے ہیں
سنسار کی سب سے بڑی آبادی میں   باہم نئے سمبندھ جنم لیتے ہیں

وہ مطلعِ ایشیا پہ ست رنگ سحر   دامانِ فضا میں بارشِ لعل و گہر
وہ لاکھوں نگوں کی تھرتھراتی ہیں لویں   مشرق کے للاٹ کا چمکتا جھومر

وہ ایک ارب ہاتھ اُٹھاتے ہوئے جس   اس رازِ حیات پر نہیں موت کا بس
یہ نسخۂ کیمیا اثر ہے جس کے   کنکر کنچن ہو اور پتھر پارس

وہ گاؤں وہ شہر وہ ادارے ذیشان   علم و فن و فلسفہ پہ چڑھتی ہوئی سان
وہ کھیت وہ گھر وہ لہلہاتے ہوئے باغ   وہ چاند سی کنیائیں وہ سورج سے جوان

وہ یونیورسٹیاں وہ لاکھوں اسکول   ہر سُو نئی زندگی کے کھلتے ہوئے پھول
وہ گاتی ہوئی نئی مشینوں کی لَے   وہ اک نئی تہذیب کے آئین و اصول

کھلتا ہے اہم ترین باب تاریخ — یہ شعلۂ نغمۂ رباب تاریخ
یہ سینۂ وقت میں دہکتی ہوئی آگ — کروٹ لیتا ہوا شباب تاریخ

وہ چین وہ امن ایشیا کا ضامن — وہ چین کہ ایک جس کا ظاہر باطن
پیغمبرِ صلح کُل امامِ تہذیب — وہ چین کہ مشرق کے پھرے جس سے دن

شائستۂ انقلاب انساں کا وطن — اُگتے سورج کا جگ جگاتا درپن
وہ نغمۂ زندگی کا بجتا ہوا ساز — وہ سارے ایشیا کے دل کی دھڑکن

انقلاب چین پر اردو زبان میں جا بکدست ترقی پسند شعرا نے متعدد نظمیں کہی ہیں۔ لیکن فراق کی اس نظم کی گہرائی، بلندی نظر اور وسعت نظر، نازک حقیقت نگاری، رچاؤ اور سجاوٹ، روح انقلاب کو زندہ کر دینے کی صلاحیت اور بیان کا یہ جادو ہمیں کہیں اور نہیں ملتا۔

فراق کی شاعری میں ایک چیز جو خاص توجہ کی مستحق ہے وہ استعاروں، تشبیہوں اور ترکیبوں کی ندرت و کثرت ہے۔ فراق نے رنگا رنگ تشبیہوں سے اردو کا دامن مالا مال کر دیا ہے۔ تشبیہوں کی ایک کائنات ہمیں فراق کی شاعری میں ملتی ہے۔ یہ تشبیہیں محض برائے فن نہیں ہیں بلکہ غائر نظری اور معنویت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ واواری میں فراق کی چند ترکیبیں پیش

کرتا ہوں ۔ بارِ نشاط ۔ خمارِ ماضی ۔ التفاتِ سرگراں ۔ جنبشِ سکوں نما ۔ گناہِ پاک طینت ۔ میراثِ بہیمیت ۔ شکوۂ رہگذر نما ۔ نغمۂ سیال ۔ شعلۂ نوائے بہار ۔ عکسِ آئینہ گداز ۔ رگِ پیمانہ ۔ عشقِ سبک روح ۔ شبِ فسانہ ساز ۔ ہوائے بادہ ساز ۔ شبِ شایانِ گناہ ۔ نرگسِ پیالہ زن ۔ کفرِ شعلہ زن ۔ نخلِ سرِ دریائے معاصی ۔ باطلِ حق نما ۔ شادیانۂ غم ۔ خاکسترِ ماضی ۔ زہرابۂ حیات ۔ وجدانِ گناہ ۔ عکسِ وہم ۔ وارداتِ سحر ۔ خنجرِ رنگ و بو ۔ شائستہ انقلاب ۔ آفتابِ خم و سبو ۔ بلائے آزادی ۔ حسنِ نرم خو ۔ کئی سو بالکل نئی تشبیہیں اور استعارے فراقؔ کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں۔ اُنھیں جمع کیا جائے تو ہمیں کئی سو نئے خیالات، نئے اور سچے احساسات بلکہ نئی حقیقتیں ہاتھ آئیں گی اور محاورے اور روزمرّہ تو جس کثرت سے فراقؔ کے یہاں ملتے ہیں وہ اس دور کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں تلاش کرنے پر بھی نہ ملیں گے۔

فراقؔ کی رباعیوں کو بھی جو شہرت اور جیسی شہرت و مقبولیت نصیب ہوئی ہے وہ غالباً جوشؔ کی رباعیوں کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ رباعیوں میں جوشؔ کا کارنامہ ایک یادگار چیز ہے اور خود فراقؔ جوشؔ کی شاعری کو دل سے سراہتے ہیں۔ یہی حال جوشؔ کا ہے جو اس دور میں اگر کسی کی شاعرانہ عظمت کے قائل ہیں تو غالباً صرف فراقؔ کے۔ اس سلسلے میں ایک بہت پُرلطف لطیفہ ہے۔ ایک بار ایک اوسط درجے کی غزل کہہ کر فراقؔ نے اُسے جوشؔ کے پاس "آج کل" میں شائع ہونے کے لیے بھیجی اُدھر سے بہت جلد جوشؔ کا جواب

آیا — تین سطروں کا — "یہ غزل آپ کی ہو ہی نہیں سکتی۔ آپ کیوں میری فراق شناسی کا امتحان لیتے ہیں — من اندازِ قدت را می شناسم — جوش"

ہاں، تو فراق کی رباعیوں کا ذکر ہے جنھیں تین ادوار و اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔ کچھ کم سو رباعیاں ۱۹۲۹ء میں فراق نے کہی تھیں۔ یہ سب کی سب عشقیہ ہیں۔ کچھ اخلاقی اور فلسفیانہ بھی ہیں۔ پندرہ سولہ برس تک جہاں تک رباعیوں کا تعلق ہے خاموش رہ کر پھر ۱۹۴۴ء میں فراق کی جمالیاتی رباعیوں کا دَور آتا ہے جو 'روپ' کے نام سے مشہور ہیں۔ پھر آٹھ برس کے وقفے کے بعد ۱۹۵۲ء میں کانپور ہسپتال میں ہرنیا کے نشتر کے بعد بستر علالت سے معنی کرانہ رباعیوں کی تخلیق فراق نے کی۔ رباعی میں اتنی شعریت، نغمگی کا ایسا زیروبم، ایسا بھرپور لہجہ، ایسی گھلاوٹ اور حلاوت یا ایسی غزلیت فراق سے پہلے بہت کم دیکھنے میں آتی تھی۔ کائنات میں جو حسن جمال فراق نے دیکھا تھا وہی حسن وجمال ان رباعیوں میں جلوہ گر ہے۔

دورِ اوّل (۱۹۲۹ء) کی کچھ رباعیاں سنئے :۔

ہر سمت خموشی کا سماں ہوتا ہے
عالم ہے کہ بے لاگ پڑا سوتا ہے
سُنتا ہوں شبِ تار کے سناٹوں میں
لے لے کے ترا نام کوئی روتا ہے

اُٹھے گی اُنھیں کی آنکھ تیرے آگے
کب معرکہ سے کبھی یہ پہلے بھاگے
آئی تھی اُنھیں کو نیند گہری سرِدار
اے دوست ترے دیکھنے والے جاگے

کھوتے ہیں اگر دھیان تو کھو لینے دو　　ایسے میں ہو جائے وہ ہو لینے دو
تجھ سے جو چھٹے صبر بھی کر لیں گے کبھی　　اس وقت تو جی کھول کے رو لینے دو

دن ڈوب گیا رات کی اندھیاری ہے　　ہر سمت خموشی کا سماں طاری ہے
تارے نکلے تو درد سینے میں اٹھا　　وہ آنکھ کی یہ قلب کی بیداری ہے

ہر ایک نظر یہ کام کرتی بھی نہیں　　ہر ایک نگاہ یوں اترتی بھی نہیں
صدقے ترے دیکھنے کے ظالم دل پر　　پڑتی ہے وہ چوٹ جو ابھرتی بھی نہیں

خلقت کو سنوار دے عبادت کیا ہے　　دنیا کا شباب آئے جنت کیا ہے
ہاں میکدۂ جہاں کا ذرہ ذرہ　　سرشارِ مجاز ہو حقیقت کیا ہے

دوسرے دور (۱۹۴۴-۴۵ء) یعنی 'روپ' کی کچھ رباعیاں سنیئے:۔

لہروں میں کھلا کنول نہائے جیسے　　دوشیزۂ صبح گنگنائے جیسے
یہ روپ یہ لوچ یہ ترنم یہ نکھار　　بچہ سوتے میں مسکرائے جیسے

مکھڑے کی ضو سے دشتِ ایمن پُر نور　　جوبن کی لَو سے جھپکے شمعِ سرِ طور
آنکھوں میں گناہِ اولیں کی ترغیب　　رفتار سے لڑئے موجِ صہبائے طور

بالوں میں خنک سیاہ راتیں ڈھلتی　　گالوں کی شفق کے اوٹ شمعیں جلتی
تاروں کی سرکتی چھاؤں میں بستر　　اک جانِ بہار اٹھی ہے آنکھیں ملتی

آجا کہ کھڑی ہے شام پہ وہ گھیرے   مدت ہوئی جب ہوئے درشن تیرے
مغرب سے سنہری گرد اُٹھی سوئے مستاف   سورج نے اگنی رتھ کے گھوڑے پھیرے

گل ہیں کہ رُخ گرم کے ہیں انگارے   بالک کے نین سے ٹوٹتے ہیں تارے
رحمت کا فرشتہ بن کے دیتی ہے سزا   ماں ہی کو پکارے اور ماں ہی مارے

وہ گاٹے کو دوہنا سہانی صبحیں   گرتی ہیں بھرے تھن سے چمکتی دھاریں
گھٹنوں پہ کاسں کا وہ کھنکنا کم کم   یا چٹکیوں سے پھوٹ رہی ہیں کرنیں

آنسو سے بھرے بھرے یہ نیناں رس کے   ساجن کب اے سکھی تھے اپنے بس کے
یہ چاندنی رات یہ برہ کی پیڑا   جس طرح اُلٹ گئی ہو ناگن ڈس کے

اب تیسرے دَور (۱۹۵۲-۵۳ء) کی رباعیاں سُنئے :-

اک حلقۂ زنجیر تو زنجیر نہیں   اک نقطۂ تصویر تو تصویر نہیں
تقدیر تو قوموں کی ہوا کرتی ہے   اک فرد کی قسمت کوئی تقدیر نہیں

صحرا میں زمان و مکاں کے کھو جاتی ہیں   صدیوں بیدار رہ کے سو جاتی ہیں
اکثر سوچا کیا ہوں خلوت میں فراقؔ   تہذیبیں کیوں غروب ہو جاتی ہیں

اگر تیسری عالمگیر جنگ ہوئی تو اُس کے نتیجے۔

صدیوں کے بنے کام بگڑ جائیں گے　　دھرتی پہ علم موت کے گڑ جائیں گے
سنولا جائے گا آفتابِ تہذیب　　رُخسارِ فضا پہ نیل پڑ جائیں گے

کچھ رندوں کو سُن گُن سی ملی ہے ساقی　　نو جگ کے جنم کی یہ گھڑی ہے ساقی
تخلیق کے لمحے تھرتھرائے سرِ جام　　یہ شام اک گردبن رہی ہے ساقی

خطرے میں ہے آج اپنا ننگ و ناموس　　ہم لاکھ کھینچیں یہ کرہی لیں گے مانوس
معلوم نہیں کیا تجھے کس گھات میں ہیں　　امریکہ کے یہاں ہزاروں جاسوس

اُونچا سودا پٹا رہے ہیں بونے　　پگلا رکھا ہے ماضیوں کی رَو نے
گھاٹے میں دے دیا ہے مستقبل کو　　اور حال کو بیچتے ہیں اَونے پَونے

ہابیل کے داغِ خوں تو دھو لینے دو　　میراثِ بہیمیت تو کھو لینے دو
فوق الانسان کی منتظر ہے دُنیا　　انسان کو انسان تو ہو لینے دو

آپ نے دیکھ لیا کہ غزل، مقفیٰ نظم اور رباعی کو فراق نے کیا کیا سدا سہاگ قدریں دیں۔ ہمارے کلچر کی کتنی صحیح خدمات فراق نے انجام دیں، ہمارے شعور کو کیا کیا عظمتیں اور روشنیاں فراق کی شاعری نے عطا کیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے نوجوان ادیبوں پر جتنا گہرا اور وسیع اثر فراق کا پڑا ہے کسی اور شاعر کا نہیں پڑا۔ فراق کے مجموعوں کے ورق اُلٹتے وقت ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ کاغذ کے

اوراق کو ہم نہیں چھوڑ رہے ہیں بلکہ ایک انسان کا جسم چھو رہے۔ فراق کی آواز کی تھرتھراہٹ میں ہم اپنے دلوں کی دھڑکنیں سُن لیتے ہیں۔

اب صرف ایک اور بات کی طرف اشارہ کرنا ہے اور وہ ہے فراق صاحب طرز ہیں۔ اُردو نثر کے بیسوں مشاہیر سے فراق کا اسلوب بالکل جدا ہے اُن کی شاعری کی لے اور اُس کا زیروبم یا اُس کی خوش آہنگی یہ تمام صفات بھیس بدل کر یا رفتار بدل کر فراق کی نثر میں ہمیں ملتی ہیں۔ "اندازے"، فراق کا زبردست، لاثانی اور لافانی تنقیدی کارنامہ ہے۔ تاثری تنقید کی ایسی جگمگاتی ہوئی مثال اب تک ہمارے ادب نے پیش نہیں کی تھی۔ "اندازے" کو پڑھ کر ہمیں اپنے کئی شعرا کی ذہنوں کا بالکل نیا احساس ہوتا ہے۔ "اندازے" کے علاوہ فراق کی معرکہ آرا نثر مختلف مضامین کی شکل میں ایک ہزار سے زیادہ صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ اُردو کی عشقیہ شاعری بھی نثر میں فراق کا دوسرا کارنامہ ہے۔ اگرچہ اپنی اس کتاب سے فراق مطمئن نہیں ہیں لیکن مقبولیت اسے ایسی نصیب ہوئی کہ فراق کے منظوم مجموعوں سے بھی جلد اس کی کل جلدیں فروخت ہو گئیں۔ "اندازے" کا پہلا ایڈیشن تو تین مہینوں میں ختم ہو گیا تھا۔ فراق اپنی جوانی ہی میں اپنی صحت کھو بیٹھے تھے۔ اگر روزی کمانے کی طرف سے وہ بے فکر ہو سکتے، صحت کے معاملے میں مطمئن رہتے، اگر اُن کی گھریلو زندگی اتنی خوشگوار ہوتی جتنی وہ چاہتے تھے اور اگر جم کر صرف ادبی خدمتوں کے لیے وہ اپنے کو وقف کر سکتے

تو نثر و نظم میں جو بڑی دین اُنھوں نے ہمیں دی ہے کم سے کم اُس کا دُوگنا اب تک وہ ہمیں دے چکے ہوتے۔ پھر بھی ایک درجن سے زیادہ ضخیم اور پُرمغز نثر و نظم کی جلدیں اب تک وہ ہمیں دے چکے ہیں اور یہ جلدیں فراقؔ کو اُردو نظم و نثر کے بلند ترین اور لافانی مشاہیر کی صف میں مستقل جگہ دیتی ہیں۔

مختصراً فراقؔ کی زندگی کے واقعات یہ ہیں۔ پیدائش ۲۸ اگست ۱۸۹۶ء گورکھپور کے ایک مشہور کائستھ گھرانے میں۔ فراقؔ کے والد منشی گورکھ پرشاد عبرتؔ چوٹی کے وکیل تھے اور اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے حالیؔ و آزادؔ کے ساتھ ان کا نام لیا جاتا تھا۔ فراقؔ کی تعلیم انگریزی اسکول میں ہوئی پھر الٰہ آباد یونیورسٹی میں اُس کی تکمیل ہوئی۔ اُردو فارسی کی تعلیم باقاعدہ کم، بے قاعدہ زیادہ تھی۔ فراقؔ نے اُردو زبان جتنی سیکھی اُس سے زیادہ اُسے ایجاد کیا۔ تعلیم ختم ہونے کے بعد آئی۔سی۔ایس کے لیے اُن کا انتخاب ہو گیا تھا لیکن آزادیٔ وطن کی تحریک میں شریک ہو کر ۱۹۲۰ء میں ڈیڑھ برس کے لیے اُنھیں قیدِ فرنگ میں رہنا پڑا۔ اس کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے انھیں کانگرس کے انڈر سیکرٹری کے عہدے پر بُلا لیا۔ ۱۹۲۷ء میں کانگرس سے الگ ہو کر وہ لکھنؤ میں ایک کالج میں پروفیسر ہو گئے۔ ۱۹۳۰ء سے اب تک الٰہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی زبان و ادب کے پروفیسر ہیں۔ فراقؔ کی طبیعت میں وحشت، بےچینی، دُکھ اور اُداسی غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے۔ جتنی شدید محبت اُن کے دل میں ہے

کبھی کبھی قریب قریب اُتنا ہی تیز عتاب بھی اُن کو آجاتا ہے۔ لیکن یہ جھلاہٹ دیر تک قائم نہیں رہتی۔ جو بلند سنجیدگی اُن کے شعور میں ہے اور جو گہرائی اُن کے اور اک میں ہے اُسے دیکھتے ہوئے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ مزاح و نظرافت ہنسنے ہنسانے کی غیر معمولی صلاحیت اُن میں کیونکر آگئی۔ فراق کی شخصیت جتنی زود آشنا ہے اُتنی نا قابلِ فراموش ہے۔ یہ شخصیت شعور پر چھا جاتی ہے۔ فراق کو اپنے احساسِ تنہائی کا بسا اوقات رونا رہتا ہے۔ ادبی زندگی میں پرستار و مدّاح بہت ملے لیکن ساتھی اور دوست بہت کم ملے۔ جو ملے وہ دور افتادہ ہیں۔ پروفیسری کی زندگی میں اُن کے معاصرین میں شاید ایک آدھ کو چھوڑ کر کسی میں اتنی صلاحیت نہیں کہ اُس مفکرانہ فضا اور اُس سنجیدگی کا بار اُٹھا سکے۔ جس سے فراق کی صحبت میں دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ایسی شخصیت سے ہم آہنگ ہونے میں پڑھے لکھوں کی بھی آزمائش ہو جاتی ہے لیکن جو اس آزمائش میں تھوڑی دیر کے لیے بھی پورا اُتر گیا اُسے فراق کی انسان دوستی، اُن کے بے پناہ خلوص اور اُن کی پُر عظمت شخصیت کا کافی اندازہ ہو جاتا ہے۔ فراق سے اپنی شخصیت کا تصادم اور تضاد وہی شخص محسوس کر سکتا ہے جس کی فطرت میں کوئی بل ہو اور اب تو فراق کا تکیہ شائقین کے لیے مرجعِ خلائق بن چکا ہے۔

اب اُسی کا تکیہ زمانہ میں بنا ہے مرجعِ خلق ہے
جو فراق تیرے لیے پھرا کبھی دربدر کبھی کو بہ کو

ہمارے ادبی کلچر کی توسیع اور بقا کے لیے فراق برابر سوچتے رہتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ مناسب اُردو ادب کی ہزار ہا کتابیں اگر فی سو صفحہ چار پانچ آنے کے حساب سے چھپ سکیں اور بک سکیں تو سماجی شعور میں انقلاب آ سکتا ہے۔ فراق کو اس بات کا افسوس ہے کہ ترقی پسند ادب کی تحریک آج سارے ہندوستان و پاکستان پر جب چھا چکی ہے عین اُس وقت کچھ خود پرست ترقی پسند ادیبوں میں گٹ بندی کا مہلک مرض پھیل رہا ہے۔ ترقی پسند ادیبوں کو آپس میں چشمک نہ رکھنی چاہیے۔ وہ محبت اور باہمی قربت جو ترقی پسند ادیبوں میں ہونی چاہیئے اُس کا فقدان دیکھ کر فراق کو دلی صدمہ ہوتا ہے۔ اب تو بجائے محبت و قربت کی سرگرمیوں کے انداز میں کہیں کہیں باہمی غیبت شروع ہو گئی ہے۔ اس کا ازالہ ضروری ہے۔

ایک دوسری بات جو فراق کی شاعری کو بہت ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ جو لوگ اُردو پڑھے ہوئے نہیں ہیں وہ جب فراق کے اشعار سنتے ہیں یا ہندی حروف میں پڑھتے ہیں تو اُس کی شگفتگی اور نرمی، اُس کی جھنکار اور رنگینی پر وجد کرنے لگتے ہیں۔ ہندوستان میں ایسے نوجوانوں کی تعداد لاکھوں ہے جنھیں بدقسمتی سے اُردو نہیں پڑھائی گئی۔ لیکن جو فراق کی شاعری کو اپنے کلیجے کا ٹکڑا بنائے ہوئے ہیں اور جنھیں فراق کے متعدد اشعار یاد ہو گئے ہیں۔ اُردو ادب و شاعری میں آج پچیس تیس نام بہت مشہور ہیں۔ واقعی بہت

مشہور ہیں۔ لیکن غالباً یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ جو سحر کارانہ کشش فراقؔ کے تخلص میں ہے وہ صرف فراقؔ کا حصّہ ہے۔ شاعر اور شاعری کی عظمت پر فراقؔ کی دو رباعیاں پیش کر کے رخصت چاہوں گا :-

لَے ہیں مری گونجتا ہے سورج منڈل[1]
میرے سوزِ دروں میں پڑ کر ہوئی حل
دُنیا میں جب آدمی نے آنکھیں کھولیں
اُس وقت سے آج تک کی تاریخِ ملل

پیغمبرِ شعر ہوں سمجھ میرا مقام
صدیوں میں پھر سنائی دے گا یہ پیام
وہ دیکھ کہ آفتاب سجدے میں جھکے
وہ دیکھ اُٹھے دیوتا بھی کرنے کو سلام

---

[1] نظامِ شمسی اور اُس کے چکر کھاتے ہوئے سیارے